ماہنامہ

اشراق

لاہور

نومبر ۲۰۲۲ء

زیرسرپرستی

جاوید احمد غامدی

"نفس کو اضطراب اور بے چینی سے روک لیا جائے تو عربی زبان میں اِسے صبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اِس کا ابتدائی مفہوم ہے۔ پھر اِسی سے مشکلات اور موانع کے علی الرغم پامردی، استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہنے کے معنی اِس میں پیدا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ آیت میں جس صبر کا ذکر ہے، وہ عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جسے بے بسی اور درماندگی کی حالت میں مجبوراً اختیار کیا جائے، بلکہ عزم و ہمت کا سرچشمہ اور تمام سیرت و کردار کا جمال و کمال ہے۔ اِس سے انسان میں یہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے ناخوش گوار تجربات پر شکایت یا فریاد کرنے کے بجائے وہ اُنھیں رضامندی کے ساتھ قبول کر لے اور خدا کی طرف سے مان کر اُن کا استقبال کرے۔ اِس مفہوم کے لحاظ سے 'صَابِر' وہ شخص ہے جو ہر خوف و طمع کے مقابل میں اپنے موقف پر قائم اور اپنے پروردگار کے فیصلوں پر راضی اور مطمئن رہے۔"

—— قرآنیات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۳۴　شمارہ ۱۱　نومبر ۲۰۲۲ء　ربیع الثانی ۱۴۴۴ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فہرست

شذرات

علم حدیث کی نوعیت اور اُس کی جمع و تدوین (۴)　سید منظور الحسن　۴

قرآنیات

البیان: الاحزاب ۳۳: ۲۸-۳۵ (۳)　جاوید احمد غامدی　۱۵

مقالات

''میزان'': توضیحی مطالعہ: قانون سیاست (۳)　محمد عمار خان ناصر　۲۶

نقد و نظر

سید مودودی، سید قطب اور علی گڑھ　خورشید احمد ندیم　۳۲

نقطۂ نظر

اوائل عمر میں تصور خدا کی تشکیل میں والدین اور اساتذہ کے شخصی اثرات　ڈاکٹر عرفان شہزاد　۳۶

سیر و سوانح

مہاجرین حبشہ (۱۳)　محمد وسیم اختر مفتی　۴۱

اصلاح و دعوت

اللہ اور رسول کی محبت　ڈاکٹر ریحان احمد یوسفی　۵۳

ز چشم آستین بردار　محمد ذکوان ندوی　۵۸

وفیات

پوتے کی وفات پر غامدی صاحب کے تاثرات　سید منظور الحسن　۶۴

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!　سید منظور الحسن　۶۷

نوشیروان غامدی (شیرو) کے نام آخری خط　جواد احمد غامدی　۷۰

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا　محمد حسنین اشرف　۷۵

شیرو (نوشیروان) کا ایک سال اور بیت گیا　جواد احمد غامدی　۷۷

فرشتے نوشیروان کا پیغام اپنے والدین کے نام...　وقاص رشید　۸۱

فی شمارہ　50 روپے
سالانہ　500 روپے
رجسٹرڈ　1000 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک
سالانہ　50 ڈالر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

سید منظور الحسن

علم حدیث کی نوعیت اور اُس کی جمع و تدوین

(۴)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خلاصۂ کلام

۱۔ محدثین کا اپنی دریافت شدہ اور محققہ صحیح احادیث میں ترک و اختیار کا رویہ اور ثقہ راویوں میں سے کئی راویوں سے روایات نہ لینے کا فیصلہ اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ حدیث کی جمع و تدوین کو انفرادی اور اختیاری کام سمجھا جاتا ہے۔ محدثین اپنی ذاتی تحقیق، ذاتی اطمینان اور ذاتی ذوق کی بنا پر روایات کا انتخاب کرتے تھے اور اسے اپنی ذاتی کاوش کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اُن کے کام میں دوسروں سے اختلاف پایا جاتا تھا اور وہ اپنے کام سے اختلاف کی گنجایش کو تسلیم کرتے تھے۔

۲۔ اِن کی تحقیق و تنقیح کا کام مسلسل جاری رہتا ہے۔ اِس معاملے میں انتہائی کڑے معیارات پر پرکھنے کے بعد اِن کے رد و قبول کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اِس فیصلے کے بعد بھی نظر ثانی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ کہ علما و محدثین جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے کسی مشتبہ بات کی روایت دنیا اور آخرت، دونوں میں نہایت سنگین نتائج کا باعث بن سکتی ہے۔ لہٰذا وہ آپ کی نسبت سے روایت ہونے والی ہر خبر واحد کو زیر تحقیق لاتے ہیں اور سند اور متن، دونوں پہلوؤں سے اُس کا جائزہ لیتے ہیں۔ سند کے لحاظ سے وہ راویوں کی عدالت،[۳۶] اُن کے ضبط[۳۷] اور سلسلۂ روایت کے اتصال[۳۸] کی جانچ کرتے ہیں۔ کسی روایت کا متن

۳۶۔ یعنی راوی مسلمان اور عاقل ہو، فاسق نہ ہو اور مروت سے محروم نہ ہو۔

۳۷۔ حدیث کو پورے طور سے یاد رکھنا اور محفوظ کر لینا۔

کتنا ہی دل نواز کیوں نہ ہو، اگر وہ سند کے معیارات پر پوری نہیں اترتی تو اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرنے سے صاف انکار کر دیا جاتا ہے۔ اِس کے بعد متن کا جائزہ لیا جاتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا اُس میں کوئی چیز قرآن وسنت کے یا علم و عقل کے مسلمات کے خلاف تو نہیں ہے۔ اِن معیارات سے گزارنے کے بعد بھی اُسے یقین کے درجے میں نہیں، بلکہ غالب گمان کے درجے میں رکھا جاتا ہے۔ یعنی اُنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے قطعی الثبوت نہیں، بلکہ ظنی الثبوت سمجھا جاتا ہے۔ اِسی بنا پر اِن کے رد و قبول کے معاملے میں محدثین اور فقہا کے مابین اختلاف بھی عام ہے۔ بعض اوقات ایک محدث ایک راوی کو ثقہ سمجھتا ہے، جب کہ دوسرا ایسا نہیں سمجھتا۔ اِسی طرح بعض اوقات ایک فقیہ ایک روایت کو درایتاً قبول نہیں کرتا، جب کہ دوسرا قبول کر لیتا ہے۔ اِس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک روایت بعض علما کے نزدیک مقبول اور بعض کے نزدیک نامقبول یا مردود قرار پاتی ہے۔

۳۔ حدیث کی تحقیق و تنقیح کا یہ کام نہ کسی فرد تک محدود ہوتا ہے اور نہ کسی زمانے میں مقید ہوتا ہے۔ یہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ مزید لوگ میدان میں آتے ہیں اور اِس ذخیرے کو کھنگال کر نئی تحقیقات سامنے لے آتے ہیں۔ مثلاً حدیث کی نمایاں کتابوں میں سے موطا امام مالک اور صحاح ستہ کے نسخے ۱۵۰ھ تا ۳۰۰ھ کے درمیان تالیف ہوئے۔ ابو یعلیٰ، دار قطنی، مستدرک علی الصحیحین، بیہقی، دیلمی کے مجموعے ۳۰۰ھ تا ۵۰۰ھ مرتب ہوئے۔ یہ کام دور حاضر میں بھی جاری ہے۔ چودھویں صدی ہجری میں علامہ ناصر الدین البانی کا کام اِس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ علماے حدیث میں تحقیق کی استعداد کا تفاوت، حالات اور وسائل کے فرق اور روایت اور درایت کے اصولوں اور اطلاقات میں اختلاف ہی کا نتیجہ ہے کہ حدیث کے بیسیوں مجموعے مرتب کیے جا چکے ہیں جو اپنے متن کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں احادیث کی تعداد میں بھی فرق ہے اور مقبول و مردود کی تعیین میں بھی اختلاف ہے۔

مدعا کی تفہیم کے لیے یہ چند مثالیں کفایت کریں گی۔ ایک مثال امام دار قطنی کی ہے جنھوں نے اپنی کتاب ''الالزامات والتتبع'' میں بخاری و مسلم کی کم و بیش دو سو روایتوں کی اسناد پر نقد کیا ہے۔[۳۹] دوسری مثال محمد بن

۳۸۔ سند کی ابتدا سے انتہا تک ہر راوی نے دوسرے راوی سے بلاواسطہ حدیث حاصل کی ہو اور سند سے کوئی راوی چھوٹا ہوا نہ ہو۔

۳۹۔ امام نووی نے یہ تعداد ۲۰۰ بتائی ہے، جب کہ ابن حجر نے ۱۸۸ بتائی ہے جن میں سے ۱۱۰ بخاری کی روایات ہیں (دار قطنی ۱۱۶، ارشاد الحق اثری)۔

عبداللہ حاکم نیشاپوری کی ہے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب ''المستدرک علی الصحیحین'' میں امام بخاری اور امام مسلم کے اصولوں کو بنیاد بنا کر ایسی روایات کو شامل کیا ہے جنھیں صحیحین میں درج نہیں کیا گیا۔ یہ امام بخاری اور امام مسلم سے کم و بیش ڈیڑھ سو سال بعد کا کام ہے۔ اِس لحاظ سے اِسے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی توسیع کا کام بھی کہا جا سکتا ہے۔ دور حاضر میں علامہ ناصر الدین البانی کا کام بھی حدیث کی تحقیق و تدوین پر مشتمل ہے۔ اُنھوں نے بخاری اور مسلم کی قرار دادہ کئی صحیح احادیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور کئی ضعیف احادیث کو حسن اور صحیح کے درجے میں رکھا ہے۔

۴۔ حدیث کی تحقیق و تدوین کے کام کا یہ تسلسل اِس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ علماے امت ذخیرۂ احادیث میں دستیاب روایتوں کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کو یقینی نہیں سمجھتے۔ اگر وہ اِسے یقینی سمجھتے ہوں تو اِس میں نہ تحقیق کی جسارت کر سکتے ہیں اور نہ کسی اختلاف کو گوارا کر سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ یقین ہو کہ فلاں الفاظ یا فلاں اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فرمودہ ہیں تو اُن کی کھوج کرید کرنا اور اُن میں اختلاف کی راہ ڈھونڈنا ایمان کے منافی ہے۔ کوئی مسلمان اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔[۴۰]

۴۰۔ یہاں بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال آ سکتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور ان کو نقل کرنے والے صحابہ بھی متعین ہیں اور دور رسالت اور دور صحابہ کے بعد ان میں کوئی اضافہ بھی ممکن نہیں ہے تو پھر اس میں اختلاف اور تحقیق کے تسلسل کا کیا سبب ہے؛ ہونا تو یہی چاہیے کہ جیسے دور رسالت کے بعد قرآن کے متن پر کوئی بحث نہیں ہے، اور اس کی تحقیق و تدوین کی نہ ماضی میں کوئی ضرورت پیش آئی اور نہ مستقبل میں پیش آ سکتی ہے، یہی معاملہ احادیث کے ساتھ ہونا چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خیال درست نہیں، کیونکہ قرآن اجماع و تواتر سے اور باللفظ منتقل ہوا ہے، جب کہ احادیث اخبار آحاد سے اور بالمعنیٰ منتقل ہوئی ہیں۔ روایت بالمعنیٰ کو ایسے سمجھیے کہ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر یا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن کی کسی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، اُنھیں قرآن کی تفسیر تو کہا جا سکے گا، قرآن نہیں کہا جائے گا۔ یعنی مطلب یہ ہو گا کہ ان حضرات نے قرآن کی آیت کو اپنے فہم کے مطابق اور اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ احادیث کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس میں سامع نے اسے اپنی سماعت کے مطابق سنا ہے، اپنے فہم کے مطابق سمجھا ہے اور اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مزید یہ کہ ہم مفسر کے قول کی صحت کو قرآن کے متن کی روشنی میں جانچ سکتے ہیں، مگر احادیث کے معاملے میں یہ موقع موجود نہیں ہے۔ نہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس موجود ہیں اور نہ آپ کے اصل الفاظ دستیاب ہیں۔

۵۔حدیث کے حوالے سے یہی وہ مسلمہ حقائق ہیں جن کی بنا پر استاذ گرامی کا موقف ہے کہ اِنھیں قرآن و سنت کے برابر نہیں، بلکہ ان کے تابع اور ماتحت رکھنا چاہیے اور اِن کے مندرجات کو دین میں کسی منفرد اور مستقل بالذات حکم کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔

خلاصۂ مباحث

یہاں جملہ مباحث کا خلاصہ نکات کی صورت میں درج ہے:

۱۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے حوالے سے جو بات ارشاد فرمائی ہے، اُس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ اصلاً اللہ کی بات ہے، جو آپ کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچی ہے۔

۲۔چنانچہ آپ اگر عالم بالا کی خبر دیں، ارض و سما کی معلومات سے آگاہ فرمائیں، قیامت اور جنت و جہنم کے احوال بتائیں، غیب کے معاملات سے پردہ اٹھائیں، حکایت سنائیں، حاضر کی اصل بتائیں، ماضی کا کوئی واقعہ ارشاد فرمائیں، مستقبل کی کوئی پیشین گوئی بیان فرمائیں تو اِن کی حیثیت قطعی حقائق کی ہے، جن کے وقوع پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

۳۔صاحب ایمان کے لیے زیبا نہیں ہے کہ وہ آپ کے فرمودات پر شک و شبہے کا اظہار کرے۔ ایسا انکار کفر کے مترادف ہے، جس کی جسارت کوئی صاحب ایمان نہیں کر سکتا۔

۴۔تاہم، جس طرح آپ کی بات کا انکار کفر ہے، اُسی طرح آپ سے ایسی بات منسوب کرنا جو آپ نے ارشاد نہیں فرمائی، آپ پر جھوٹ باندھنے کے مترادف اور نری معصیت ہے۔ ایسی شعوری جسارت کا نتیجہ ابدی جہنم ہے۔

۵۔مسلمانوں کے جلیل القدر اہل علم نے ان مسلمات کو ہمیشہ اپنے علم و عمل کا حصہ بنایا ہے۔ چنانچہ وہ آپ کی نسبت سے سامنے آنے والی ہر یقینی بات کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں اور جو یقینی نہیں ہے، اُس کے بارے میں بہت احتیاط کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

۶۔اِسی ایمان اور اِسی احتیاط کے مجموعی تقاضوں کے پیش نظر اُنھوں نے آپ کی نسبت سے حاصل ہونے والے دین کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ اجماع و تواتر پر مبنی ہے اور دوسرا حصہ اخبار آحاد پر منحصر ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۷۔ اجماع و تواتر سے جو دین ملا ہے، اُس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یقینی ہے، اِس لیے اُس کا انکار کفر ہے۔

۸۔ اخبار آحاد سے ملنے والے حصے کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یقینی نہیں ہے۔ اُس کی نوعیت ظن غالب کی ہے، اِس لیے اُس کے بارے میں غور و فکر، تحقیق و تفتیش اور ضبط و احتیاط ضروری ہے۔

۹۔ احتیاط سے مقصود دین کو خارجی آمیزش سے محفوظ رکھنا ہے، اس کا مقصد بے اعتنائی ہرگز نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے اگر کوئی بات سامنے آئے تو اُس سے صرف نظر کرنا مکابرت ہے۔ کوئی صاحب ایمان اس کا عامل نہیں ہو سکتا۔

۱۰۔ یہ امر مسلم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دین یقینی ذرائع، یعنی اجماع و تواتر سے پہنچا ہے، وہ قرآن مجید اور سنت ثابتہ میں محصور ہے۔

۱۱۔ اِسی طرح یہ بھی تسلیم شدہ ہے کہ آپ کی نسبت سے جو دین ظنی ذریعے سے، یعنی اخبار آحاد سے پہنچا ہے، وہ احادیث کی صورت میں موجود ہے۔

۱۲۔ احادیث مبارکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے بارے میں صحابۂ کرام میں سے بعض افراد کے بیانات ہیں۔

۱۳۔ بیان کرنے والوں نے اُنھیں اپنی خواہش سے اور انفرادی حیثیت میں بیان کیا ہے۔

۱۴۔ یہ قرآن و سنت کی طرح اجماع و تواتر سے منتقل نہیں ہوئیں۔ یعنی نہ اُنھیں صحابۂ کرام نے اجتماعی طور پر منتقل کیا ہے، نہ اُنھیں مسلمانوں کی ایک نسل نے دوسری نسل کو بلا انقطاع اور بحیثیت مجموعی پہنچایا ہے۔

۱۵۔ یہ اخبارِ آحاد کے ذریعے سے منتقل ہوئی ہیں۔ یعنی اُنھیں افراد نے انفرادی طور پر سنا ہے اور انفرادی حیثیت سے آگے منتقل کیا ہے اور پھر یہ انفرادی سطح پر ایک فرد سے دوسرے فرد کو منتقل ہوتے ہوئے محدثین تک پہنچی ہیں۔

۱۶۔ یہ بالعموم، روایت بالمعنیٰ کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں۔ یعنی اِن میں سے بیش تر کے الفاظ بعینہٖ وہ نہیں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے صادر ہوئے تھے۔ صحابۂ کرام میں سے بعض راویوں نے اِنھیں آپ سے سن کر اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

۱۷۔ روایت بالمعنیٰ کا یہ سلسلہ صرف صحابہ کے رواۃ تک محدود نہیں ہے، بلکہ اُن سے آگے تابعین نے اور

اُن سے آگے تبع تابعین نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ یعنی بالعموم لفظوں کو نہیں، بلکہ معنی و مفہوم کو منتقل کیا ہے۔

۱۸۔ جب واقعہ یہ ہے کہ صحابی نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو اپنی سماعت، اپنے فہم اور اپنی یادداشت کے لحاظ سے انفرادی طور پر بیان کیا ہے تو اُس میں سہو و نسیان اور ترمیم و اضافے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہی معاملہ صحابی کی بات کی نسبت سے تابعی کے ساتھ ہے اور تابعی کی نسبت سے تبع تابعی اور اُس سے آگے کے راوی کے ساتھ ہے۔

۱۹۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی موقعے یا ایک ہی واقعے کی روایات میں فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق الفاظ و اسالیب کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے، مفہوم کے اعتبار سے بھی اور کمی اور زیادتی کے لحاظ سے بھی۔[۴۱]

۲۰۔ یہ فرق بعض اوقات اختلاف اور تناقض کی صورت میں بھی سامنے آ جاتا ہے۔[۴۲]

۴۱۔ مثال کے طور پر اسرا و معراج کی روایتوں میں سے بعض میں یہ بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ذات باری تعالیٰ کے اتنے قریب ہو گئے، جیسے کمان کے دو کنارے ہوں۔ بخاری، رقم ۷۵۱۷ کے تحت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (صحابی) سے شریک بن عبد اللہ (تابعی) کی روایت میں یہ بات نقل ہوئی ہے، جب کہ بخاری، رقم ۳۴۹ کے تحت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (صحابی) کی ابن شہاب زہری (تابعی) سے منقول روایت میں یہ بات نقل نہیں ہوئی۔

۴۲۔ مثال کے طور پر اسرا و معراج کی مختلف روایتوں میں اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آسمانوں کے سفر میں چھٹے اور ساتویں آسمان پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کس پیغمبر سے ملاقات ہوئی۔ بخاری، رقم ۷۵۱۷ کے تحت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (صحابی) سے شریک بن عبد اللہ (تابعی) کی روایت میں بیان ہوا کہ آپ نے چھٹے آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور ساتویں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا، جب کہ بخاری، رقم ۳۸۸۷ کے تحت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (صحابی) کی قتادہ (تابعی) سے منقول روایت میں اس کے برعکس بات نقل نہیں ہوئی ہے، یعنی آپ نے چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔

ایک اور مثال دیکھیے: صحیح مسلم (کتاب الفضائل) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''لوگ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے گریز کرتے تھے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی: اے اللہ کے نبی، میری تین گزارشات قبول کر لیجیے۔ آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ انھوں نے پہلی گزارش یہ کی: ''میری بیٹی ام حبیبہ عرب کی حسین و جمیل عورتوں میں سے ہے۔ اس سے نکاح کر لیجیے۔ آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔...''

۲۱۔ احادیث کی جمع وتدوین اور تحقیق وتفتیش خالص انسانی کام ہے۔ محدثین مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے مختلف افراد سے احادیث حاصل کرتے ہیں۔ یہ کام وہ اپنی زندگی، اپنے حالات، اپنے تصور، اپنی ترجیح، اپنی حدوسع اور اپنی استعداد وصلاحیت کے لحاظ سے انجام دیتے ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ اِس معاملے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے، لیکن اِس کے باوجود صورت واقعہ یہ ہے کہ احادیث کی جمع وتدوین کا کام مکمل طور پر مرتب نہیں ہو پاتا۔ مزید برآں، جتنا کام بھی مرتب ہو کر سامنے آتا ہے، اُس میں کمی اور کوتاہی کے امکان کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

۲۲۔ یہی وجہ ہے کہ معاصرین ایک دوسرے کے کام پر نقد وجرح کرتے ہیں اور متاخرین متقدمین کے کام سے اختلاف یا اُس میں ترمیم واضافے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔

۲۳۔ چنانچہ محدثین نے احادیث کے بیسیوں مجموعے مرتب کیے ہیں اور ان میں سے ہر مجموعہ کسی نہ کسی پہلو سے دوسرے مجموعوں سے مختلف ہوتا ہے۔ ان میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی روایت کو بعض محدثین نے صحیح اور بعض نے ضعیف قرار دیا ہو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۲۴۔ محدثین کا اپنی دریافت شدہ اور محققہ صحیح احادیث میں ترک واختیار کا رویہ اور ثقہ راویوں میں سے کئی راویوں سے روایات نہ لینے کا فیصلہ اِس امر کو ثابت کرتا ہے کہ حدیث کی جمع وتدوین کو انفرادی اور اختیاری کام سمجھا جاتا ہے۔ محدثین اپنی ذاتی تحقیق، ذاتی اطمینان اور ذاتی ذوق کی بنا پر روایات کا انتخاب کرتے ہیں اور اُسے اپنی ذاتی کاوش کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اُن کے کام میں دوسروں سے اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ اپنے کام سے اختلاف کی گنجایش کو تسلیم کرتے تھے۔

اس حدیث پر اشکال یہ ہے کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ کے موقع پر ۸ھ میں اسلام قبول کیا تھا، جب کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس سے قبل ہی ۶ھ یا ۷ھ میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بنت ابی سفیان سے نکاح کر چکے تھے۔ پھر اس درخواست کے کیا معنی؟ محدثین نے اس حدیث کو صحیح مانتے ہوئے اس کی مختلف توجیہیں کی ہیں، لیکن علامہ ابن حزم نے اسے موضوع کہا ہے اور اسے ایک راوی عکرمہ بن عمار کی گھڑی ہوئی روایت قرار دیا ہے۔ اس کے جواب میں شیخ ابن الصلاح نے عکرمہ کو ثقہ راوی بتایا ہے اور ان کی تضعیف کرنے اور ان کی طرف وضع حدیث کی نسبت کرنے کے سلسلے میں ابن حزم پر سخت تنقید کی ہے، لیکن نہ انھوں نے اور نہ ان کے علاوہ کسی اور محدث نے ابن حزم کا شمار منکرین حدیث میں کیا ہے۔

۲۵۔ حدیث کی تحقیق و تنقیح کا یہ کام نہ کسی فرد تک محدود ہوتا ہے اور نہ کسی زمانے میں مقید ہوتا ہے۔ یہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ مزید لوگ میدان میں آتے ہیں اور اِس ذخیرے کو کھنگال کر نئی تحقیقات سامنے لے آتے ہیں۔ مثلاً حدیث کی نمایاں کتابوں میں سے موطا امام مالک اور صحاح ستہ کے نسخے ۱۵۰ھ تا ۳۰۰ھ کے درمیان تالیف ہوئے۔ ابو یعلیٰ، دار قطنی، مستدرک علی الصحیحین، بیہقی، دیلمی کے مجموعے ۳۰۰ھ تا ۵۰۰ھ مرتب ہوئے۔ یہ کام دور حاضر میں بھی جاری ہے۔ چودھویں صدی ہجری میں علامہ ناصر الدین البانی کا کام اِس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ علماے حدیث میں تحقیق کی استعداد کا تفاوت، حالات اور وسائل کے فرق اور روایت اور درایت کے اصولوں اور اطلاقات میں اختلاف ہی کا نتیجہ ہے کہ حدیث کے بیسیوں مجموعے مرتب کیے جا چکے ہیں، جو اپنے متن کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں احادیث کی تعداد میں بھی فرق ہے اور مقبول و مردود کی تعیین میں بھی اختلاف ہے۔

۲۶۔ حدیث کے اسناد کی تصحیح و تضعیف اور متن پر غور و فکر کے اصول منصوص نہیں ہیں۔ علما و محدثین نے اُنھیں اپنے فہم و فراست سے متعین کیا ہے۔

۲۷۔ یہ اصول چونکہ دین کی اساسات اور عقل عام کے مسلمات پر مبنی ہیں، اس لیے اُن کے بنیادی نکات کے حوالے سے علما و محدثین میں اتفاق پایا جاتا ہے۔

۲۸۔ البتہ اطلاقی اختلافات جا بجا ہیں۔ اِن کے نتیجے میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک محدث کے نزدیک ایک راوی ثقہ اور دوسرے کے نزدیک غیر ثقہ ہوتا ہے۔ اِسی طرح ایک محدث یا فقیہ ایک روایت کو قرآن و سنت یا عقل عام کے خلاف قرار دے کر رد کر دیتا ہے، دوسرا اُس کی تاویل کر کے اُسے قبول کر لیتا ہے اور تیسرا اُس کے بارے میں توقف کا رویہ اختیار کرتا ہے۔

۲۹۔ یہ تمام نکات اس امر کو متعین کرتے ہیں کہ علماے امت ذخیرۂ احادیث میں دستیاب روایتوں کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کو یقینی نہیں سمجھتے۔ اگر وہ اِسے یقینی سمجھتے ہوں تو اِس میں نہ تحقیق کی جسارت کر سکتے ہیں اور نہ کسی اختلاف کو گوارا کر سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ یقین ہو کہ فلاں الفاظ یا فلاں اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فرمودہ ہیں تو اُن کی کھوج کرید کرنا اور اُن میں اختلاف کی راہ ڈھونڈنا ایمان کے منافی ہے۔ کوئی مسلمان اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔[۴۳]

۴۳۔ یہاں بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال آ سکتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور ان کو

۳۰۔ یہی وہ مسلمہ حقائق ہیں، جن کی بنا پر استاذِ گرامی کا موقف ہے کہ احادیث کو قرآن و سنت کے برابر نہیں، بلکہ اُن کے تابع اور ماتحت رکھنا چاہیے اور اِن کے مندرجات کو دین میں کسی منفرد اور مستقل بالذات حکم کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ اپنی ایک تحریر میں اُنھوں نے اِس بات کو تفصیل سے سمجھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”حدیث سے متعلق کسی کام کو سمجھنے کے لیے اِس حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ دین کا تنہا ماخذ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔ آپ سے یہ دین دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے: ایک قرآن، دوسرے سنت۔ یہ بالکل یقینی ہیں اور اپنے ثبوت کے لیے کسی تحقیق کے محتاج نہیں ہیں۔ اِنھیں مسلمانوں نے نسلاً بعد نسلٍ اپنے اجماع اور تواتر سے منتقل کیا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کی ہر نسل کے لوگوں نے بغیر کسی اختلاف کے پچھلوں سے لیا اور اگلوں تک پہنچا دیا ہے اور زمانۂ رسالت سے لے کر آج تک یہ سلسلہ اِسی طرح قائم ہے۔

پورا دین اِنھی دو میں محصور ہے اور اُس کے تمام احکام ہم اِنھی سے اخذ کرتے ہیں۔ اِس میں بعض اوقات کوئی مشکل پیش آجاتی ہے۔ پھر جن معاملات کو ہمارے اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے، اُن میں بھی رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اِس کے لیے دین کے علما کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا

نقل کرنے والے صحابہ بھی متعین ہیں اور دور رسالت اور دور صحابہ کے بعد ان میں کوئی اضافہ بھی ممکن نہیں ہے تو پھر اس میں اختلاف اور تحقیق کے تسلسل کا کیا سبب ہے؛ ہونا تو یہی چاہیے کہ جیسے دور رسالت کے بعد قرآن کے متن پر کوئی بحث نہیں ہے، اور اس کی تحقیق و تدوین کی نہ ماضی میں کوئی ضرورت پیش آئی اور نہ مستقبل میں پیش آسکتی ہے، یہی معاملہ احادیث کے ساتھ ہونا چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے، کیونکہ قرآن اجماع و تواتر سے اور باللفظ منتقل ہوا ہے، جب کہ احادیث اخبار آحاد سے اور بالمعنٰی منتقل ہوئی ہیں۔ روایت بالمعنٰی کو ایسے سمجھیے کہ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر یا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن کی کسی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، اُنھیں قرآن کی تفسیر تو کہا جا سکے گا، قرآن نہیں کہا جائے گا۔ یعنی مطلب یہ ہوگا کہ اِن حضرات نے قرآن کی آیت کو اپنے فہم کے مطابق اور اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ احادیث کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس میں سامع نے اسے اپنی سماعت کے مطابق سنا ہے، اپنے فہم کے مطابق سمجھا ہے اور اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مزید یہ کہ ہم مفسر کے قول کی صحت کو قرآن کے متن کی روشنی میں جانچ سکتے ہیں، مگر احادیث کے معاملے میں یہ موقع موجود نہیں ہے۔ نہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس موجود ہیں اور نہ آپ کے اصل الفاظ دستیاب ہیں۔

کے پیغمبر تھے، اِس لیے دین کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے عالم، بلکہ سب عالموں کے امام بھی آپ ہی تھے۔ دین کے دوسرے عالموں سے الگ آپ کے علم کی ایک خاص بات یہ تھی کہ آپ کا علم بے خطا تھا، اِس لیے کہ اُس کو وحی کی تائید و تصویب حاصل تھی۔ یہ علم اگر کہیں موجود ہو تو ہر مسلمان چاہے گا کہ قرآن و سنت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اِسی سے رہنمائی حاصل کرے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ علم موجود ہے اور اِس کا ایک بڑا حصہ ہم تک پہنچ گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ علم آپ کے صحابہ نے حاصل کیا تھا، لیکن اِس کو آگے بیان کرنا چونکہ بڑی ذمہ داری کا کام تھا، اِس لیے بعض نے احتیاط برتی اور بعض نے حوصلہ کر کے بیان کر دیا۔ اِس میں وہ چیزیں بھی تھیں جنھیں وہ آپ کی زبان سے سنتے یا آپ کے عمل میں دیکھتے تھے اور وہ بھی جو آپ کے سامنے کی جاتی تھیں اور آپ اُن سے منع نہیں فرماتے تھے۔ یہی سارا علم ہے جسے 'حدیث' کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح کو جاننے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے۔ اِس سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ اُسی دین کی شرح و وضاحت اور اُس پر عمل کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا بیان ہے جو آپ نے قرآن و سنت کی صورت میں اپنے ماننے والوں کو دیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہ ہم تک کس طرح پہنچا ہے؟ تاریخ بتاتی ہے کہ اِسے حدیثوں کی صورت میں سب سے پہلے صحابہ نے لوگوں تک پہنچایا۔ پھر جن لوگوں نے یہ حدیثیں اُن سے سنیں، اُنھوں نے دوسروں کو سنائیں۔ یہ زبانی بھی سنائی گئیں اور بعض اوقات لکھ کر بھی دی گئیں۔ ایک دو نسلوں تک یہ سلسلہ اِسی طرح چلا، لیکن پھر صاف محسوس ہونے لگا کہ اِن کے بیان کرنے میں کہیں کہیں غلطیاں ہو رہی ہیں اور کچھ لوگ دانستہ اِن میں جھوٹ کی ملاوٹ بھی کر رہے ہیں۔ یہی موقع ہے، جب اللہ کے کچھ بندے اٹھے اور اُنھوں نے اِن حدیثوں کی تحقیق کرنا شروع کی۔ اِنھیں 'محدثین' کہا جاتا ہے۔ یہ بڑے غیر معمولی لوگ تھے۔ اِنھوں نے ایک ایک روایت اور اُس کے بیان کرنے والوں کی تحقیق کر کے، جس حد تک ممکن تھا، غلط اور صحیح کی نشان دہی کی اور جھوٹ کو سچ سے الگ کر دیا۔ پھر اِنھی میں سے بعض نے ایسی کتابیں بھی مرتب کر دیں جن کے بارے میں بڑی حد تک اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُن میں جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں، وہ بیش تر حضور ہی کا علم ہے جو روایت کرنے والوں نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ علم کی زبان میں اِنھیں 'اخبار آحاد' کہتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِنھیں صرف گنتی کے لوگوں نے بیان کیا ہے، قرآن و سنت کی طرح یہ اجماع اور تواتر سے منتقل نہیں ہوئی ہیں۔ چنانچہ بالعموم تسلیم کیا جاتا ہے کہ اِن سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ درجۂ یقین کو نہیں پہنچتا، اُسے

زیادہ سے زیادہ ظن غالب قرار دیا جا سکتا ہے۔

حدیث کی جن کتابوں کا ذکر ہوا ہے، وہ سب اپنی جگہ اہم ہیں، مگر امام مالک، امام بخاری اور امام مسلم کی کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور بہت مستند خیال کی جاتی ہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بڑی تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہیں۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اِن کے مرتب کرنے والوں سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ اِس علم کے ماہرین جانتے ہیں کہ اُن سے تحقیق میں غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ اِسی بنا پر وہ حدیث کی کتابوں کو برابر جانچتے پرکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کسی حدیث کے بیان کرنے والوں کو اگر سیرت و کردار اور حفظ و اتقان کے لحاظ سے قابل اعتماد نہیں پاتے یا آپس میں اُن کی ملاقات کا امکان نہیں دیکھتے یا اُن کی بیان کردہ حدیث کے مضمون میں دیکھتے ہیں کہ کوئی بات قرآن و سنت کے خلاف ہے یا علم و عقل کے مسلمات کے خلاف ہے تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ آں حضرت کی بات نہیں ہو سکتی۔ یہ غلطی سے آپ کی طرف منسوب ہو گئی ہے۔ یہی معاملہ اِن حدیثوں کے فہم اور اِن کی شرح و وضاحت کا ہے۔ اہل علم اِس معاملے میں بھی اپنی تعبیرات اِسی طرح پیش کرتے رہتے ہیں۔

یہ کام ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ ابھی پچھلی صدی میں علامہ ناصر الدین البانی نے اِس سلسلے میں بڑی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے اور حدیث کی اکثر کتابوں پر از سر نو تحقیق کر کے اُن کے صحیح اور سقیم کو ایک مرتبہ پھر الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (مقامات ۱۷۴-۱۷۷)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الاحزاب

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا
فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

(اِس طرف سے مایوس ہو کر اب یہ منافقین تمھارے گھروں میں فتنے اٹھانا چاہتے ہیں، اِس لیے)، اے نبی، اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اُس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمھیں دے دلا کر خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اُس کے رسول اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہو تو اِن سب چیزوں سے بے نیاز ہو کر اُسی کے لیے سر گرم رہو، اِس لیے کہ اللہ نے تم میں سے خوبی کے ساتھ نباہ کرنے والیوں[۵۲] کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔[۵۳] ۲۸-۲۹

۵۲۔ اصل میں لفظ 'مُحْسِنٰت' استعمال ہوا ہے۔ اِس میں 'نباہ کرنے والیوں' کا مفہوم موقع کلام نے پیدا کر دیا ہے۔

۵۳۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ یہ سوال جب امہات المومنین، خاص کر سیدہ عائشہ صدیقہ کے سامنے

رکھا گیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھیں اور اُن سے کہا گیا کہ اِس کے جواب میں وہ جلدی نہ کریں، بلکہ اپنے والدین سے بھی مشورہ کرلیں تو اُنھوں نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا کہ مجھے اِس معاملے میں کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں ہے، میں اللہ اور اُس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں۔ باقی امہات المومنین کا جواب بھی یہی تھا۔*

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تدبیر اُس فتنے کے سد باب کے لیے کی گئی جو منافقین اٹھانا چاہتے تھے۔ اِس میں ازواج مطہرات کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ چاہیں تو دنیا اور اُس کے عیش کی طلب میں حضور سے الگ ہو جائیں اور چاہیں تو اللہ ورسول اور قیامت کے فوز و فلاح کی طلب گار بن کر پورے شعور کے ساتھ ایک مرتبہ پھر یہ فیصلہ کرلیں کہ اُنھیں اب ہمیشہ کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ ازواج مطہرات نے اِس کے جواب میں جو کچھ کہا، اُن سے وہی متوقع تھا۔ چنانچہ یہ تدبیر نہایت کارگر ثابت ہوئی اور ہر شخص پر واضح ہو گیا کہ اہل بیت رسالت کا انتخاب خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اِس حرم کے اندر کسی کے لیے درا ندازی کی گنجایش نہیں ہے۔

منافقین یہ فتنہ جس طریقے سے اٹھا رہے تھے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اِس پوری سورہ پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس دور میں منافقین کی ریشہ دوانیاں جس طرح عام مسلمانوں کو اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان و برگشتہ کرنے کے لیے بہت بڑھ گئی تھیں، اُسی طرح منافقات کے ذریعے سے اُنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے سکون کو درہم برہم کرنے کے لیے بھی بڑی خطرناک مہم چلا رکھی تھی۔ منافق عورتیں امہات المومنین کے گھروں میں جاتیں اور نہایت ہم دردانہ انداز میں اُن سے کہتیں کہ آپ لوگ شریف اور معزز گھرانوں کی بیٹیاں ہیں، لیکن آپ لوگوں کی زندگی ہر راحت و لذت سے محروم بالکل قیدیوں کی طرح گزر رہی ہے۔ اگر آپ دوسرے گھروں میں ہوتیں تو آپ کی زندگی 'بیگمات' کی طرح نہایت عیش و آرام اور ٹھاٹ باٹ کے ساتھ گزرتی۔ ساتھ ہی وہ یہ وسوسہ اندازی بھی کرتیں کہ اگر یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو طلاق دے دیں تو بڑے بڑے رئیس اور سردار آپ لوگوں سے نکاح کریں گے اور آپ لوگوں کی زندگیاں قابل رشک ہو جائیں گی۔ آگے کی آیات

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۳/ ۶۲۸۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ط

نبی کی بیویو، تم میں سے جو کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرے گی،[54] اُس کے لیے دہرا عذاب

سے یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ منافقین کو بھی جب کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں جانے اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے بات کرنے کا موقع ملتا تو وہ اِس موقع سے فائدہ اٹھا کر اُن کے اندر کچھ نہ کچھ وسوسہ اندازی کی ضرور کوشش کرتے۔ اِن کوششوں سے اُن کا اصلی مقصد تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے اندر کوئی اُس طرح کا فتنہ کھڑا کرنا تھا، جس طرح کا فتنہ اُنھوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کھڑا کر دیا تھا جس کی تفصیلات سورۂ نور میں آپ پڑھ چکے ہیں، ورنہ ادنیٰ درجے میں یہ فائدہ تو اُن کو بدیہی طور پر نظر آتا تھا کہ اِس سے ازواج نبی (رضی اللہ عنہن) کے اندر بے اطمینانی پیدا ہو گی اور کیا عجب کہ اِس طرح کوئی ایسی شکل نکل آئے کہ وہ آپ کی ازواج کے ساتھ نکاح کرنے کا جو مذموم ارادہ رکھتے ہیں، وہ پورا ہو جائے۔

منافقین و منافقات کی اِن چالوں سے اگرچہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن بالکل بے خبر نہیں تھیں، بعض تلخ تجربے اُن کو ہو چکے تھے، لیکن شریف، کریم النفس اور باحیا لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اُن کے سامنے اگر ہم دردی و خیر خواہی کے انداز میں بات کرتا ہے تو وہ اُس کے کھوٹ سے واقف ہوتے ہوئے بھی، اُس کو جواب نرمی ہی سے دیتے ہیں۔ امہات المومنین رضی اللہ عنہن بھی اپنی کریم النفسی کے سبب سے اُن لوگوں کو نرمی ہی سے جواب دیتیں، جس سے یہ کمینے لوگ اِس طمع خام میں مبتلا ہو جاتے کہ اُن کا پروپیگنڈا کامیاب ہو رہا ہے اور وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' (تدبر قرآن ۶/۲۱۶)

۵۴۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ازواج مطہرات سے، معاذ اللہ، کسی فحش حرکت کا اندیشہ تھا۔ قرآن نے یہ الفاظ فتنہ پردازوں کے مخفی ارادوں کو سامنے رکھ کر استعمال کیے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... وہ رات دن اِسی تگ و دو میں تھے کہ اہل بیت رسالت سے متعلق کوئی اسکینڈل (scandal) پیدا کریں تاکہ اُن کا کلیجہ ٹھنڈا ہو اور مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ برباد ہو۔ قرآن نے یہ لفظ استعمال کر کے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو آگاہ کر دیا کہ منافقین ہم دردی و خیر خواہی کے بھیس میں در حقیقت اپنے بہت بڑے شیطانی منصوبے کی فکر میں ہیں۔'' (تدبر قرآن ۶/۲۱۹)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿٣٠﴾ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ
صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿٣١﴾

ہے[55] اور یہ اللہ کے لیے آسان سی بات ہے۔[56] اور تم میں سے جو اللہ اور اُس کے رسول کی فرماں بردار بنی رہیں گی اور نیک عمل کریں گی، اُنھیں ہم اُن کا دہرا اجر عطا فرمائیں گے[57] اور اُن کے لیے ہم نے عزت کی روزی تیار کر رکھی ہے۔[58] ۳۰-۳۱

۵۵۔ یہ اِس قانون کے مطابق ہے کہ جس کا خدا کے ہاں جو درجہ و مرتبہ ہے، اُس کا محاسبہ بھی اُسی کے لحاظ سے ہو گا۔ اِس سے قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو یہ احساس دلایا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں اُن کا مقام کس قدر بلند ہے اور اِس مقام بلند سے کسی پستی کی طرف اترنے کا نتیجہ اُن کے لیے کیسا سنگین ہو سکتا ہے۔

۵۶۔ یعنی تم میں کوئی اِس بھلاوے میں نہ رہے کہ نبی کی بیویاں ہونا تمھیں اللہ کی پکڑ سے بچا سکتا ہے یا تمھارا مرتبہ کچھ ایسا بلند ہے کہ اُس کی وجہ سے تمھیں پکڑنے میں اللہ کو کوئی دشواری پیش آسکتی ہے۔ ہرگز نہیں، خدا کا قانون بے لاگ ہے، وہ کسی کے درجے اور مرتبے یا نسبت و تعلق کی بنا پر کوئی رعایت نہیں کرے گا۔

۵۷۔ یعنی سزا بھی دگنی ہے اور جزا بھی دگنی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''اِن آیات سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ خدا کے ہاں مواخذہ اتمام حجت کے اعتبار سے ہو گا اور اعمال کا صلہ اُن حالات کے اعتبار سے ملے گا جن میں وہ انجام دیے گئے ہیں۔ ازواج نبی (رضی اللہ عنہن) کو چونکہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی معیت حاصل ہوئی اور رسول اتمام حجت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اِس وجہ سے اُن سے مواخذہ سخت ہو گا۔ اِسی طرح رسول کی رفاقت پوری وفاداری کے ساتھ چونکہ بڑا کٹھن کام ہے، اِس وجہ سے اُس کا صلہ بھی دگنا ہے۔ جرموں کے مواخذہ اور اعمال کے صلے کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے اور یہ بالکل مبنی بر عدل و حکمت ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۲۱۹)

۵۸۔ قرآن میں یہ اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام کی تعبیر ہے اور اِس کے ساتھ باعزت، یعنی 'کَرِیْم' کی صفت اِس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ یہ رزق و فضل اُن کے حق کے طور پر، ہمیشہ کے لیے اور کسی قید و شرط اور اندیشۂ احتساب و مواخذہ کے بغیر ملے گا۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾

نبی کی بیویو، تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔[۵۹] اگر تم خدا سے ڈرو[۶۰] تو (اِن لوگوں کے ساتھ) نرمی کا لہجہ اختیار نہ کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے،[۶۱] وہ کسی طمع خام میں مبتلا ہو جائے اور معروف کے مطابق بات کرو۔[۶۲] ۳۲

۵۹۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت و تعلق کی وجہ سے تمھاری ایک خاص حیثیت ہے جس کو تمھیں ہر حال میں ملحوظ رکھنا چاہیے اور کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جو اِس مرتبے اور مقام کے منافی ہو۔ تمھارے ہر طرز عمل کے اثرات اُس دعوت اور مشن پر ہوں گے جس کے لیے خدا نے اپنے پیغمبر کو مبعوث فرمایا ہے۔

۶۰۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ آگے جو ہدایات دی جا رہی ہیں، اُن پر اِس تقویٰ کے بغیر اُن کی روح کے مطابق عمل نہیں کیا جا سکتا۔

۶۱۔ اِس سے وہ کینہ و حسد مراد ہے جو اشرار منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ اِس کے سبب سے وہ اِس کوشش میں رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طریقے سے وہ آپ کی ازواج مطہرات کو بدنام کرنے کی کوئی صورت پیدا کر سکیں۔

۶۲۔ یعنی جیسے اُن لوگوں سے کی جاتی ہے جن سے کسی فتنے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ جو کچھ کہنا ہو، بغیر کسی رو رعایت کے سیدھے صاف طریقے سے کہہ دیا جاتا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ یہ ہدایت بھی خاص اُنھی حالات کے لحاظ سے کی گئی جو اُس وقت امہات المومنین کو درپیش تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...عام حالات میں تو پسندیدہ طریقۂ کلام یہی ہے کہ آدمی تواضع کا انداز اختیار کرے، لیکن بعض اوقات حالات و مصالح کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اِس سے مختلف روش اختیار کی جائے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اِس دور میں منافقین و منافقات رات دن اِس تگ و دو میں تھے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے کوئی ایسی بات نکالیں جس کو ایک فتنہ بنا سکیں۔ اِن لوگوں کی باتیں ہم دردانہ رنگ میں ہوتی تھیں، اِس وجہ سے امہات المومنین رضی اللہ عنہن بھی اُن کا جواب اپنی شرافت نفس کے سبب سے نرم انداز ہی میں دیتی تھیں جس سے یہ مفسدین دلیر ہوتے جا رہے تھے اور اِن کو یہ توقع ہو چلی تھی کہ وہ بہت جلد اپنی

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ

تم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور اگلی جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔[63] اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت پر قائم رہو۔[64] اللہ تو یہی چاہتا ہے، اِس

سازش میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اِن خاص حالات کی بنا پر امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو اپنا رویہ بدل دینے کی ہدایت ہوئی۔ فرمایا کہ اے نبی کی بیویو، تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو۔ نبی کے ساتھ نسبت کے باعث تمھاری نیکی اور بدی، دونوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ تمھاری نیکی دوسروں کے لیے مثال اور نمونہ بنے گی اور تم سے کوئی غلطی صادر ہو گی تو اُس کو بھی اصحاب الاغراض حجت بنائیں گے۔ اِس وجہ سے تمھارے لیے احتیاط کی روش اولیٰ ہے۔ اگر منافقین تمھارے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنے کی کوشش کریں تو بربنائے مروت و شرافت اُن کی بات کا جواب نرمی و تواضع سے نہ دو کہ جس کے دل میں اللہ اور اُس کے رسول کے خلاف بغض و حسد ہے، وہ کوئی غلط توقع کر بیٹھے، بلکہ صاف انداز میں اُس سے اِس طرح بات کہو کہ اگر وہ اپنے دل میں کوئی برا ارادہ لے کر آیا ہے تو اُس کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ یہاں اُس کی دال گلنے والی نہیں ہے۔‘‘

(تدبر قرآن ۶/ ۲۲۰)

۶۳۔ یہ ہدایت بھی اُسی منصب اور اُس کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے ہے جو ازواج مطہرات کو حاصل تھا کہ اُنھیں زمانۂ جاہلیت میں بڑے لوگوں کی بیگمات کے طریقے پر اپنی زیب وزینت کی نمایش کرتے ہوئے باہر نہیں نکلنا چاہیے، بلکہ جو حالات اُنھیں درپیش ہیں، اُن میں باہر نکلنے ہی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اِس لیے کہ منافقین شب و روز اِسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ وہ اُن سے متعلق کوئی اسکینڈل پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ عام عورتوں کے ساتھ اِس ہدایت کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اپنے حالات اور اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے اُس زمانے میں بھی، جہاں چاہیں، جا سکتی تھیں اور اب بھی جا سکتی ہیں۔ اجنبیوں کے سامنے زیب و زینت کی نمایش، البتہ اُن کے لیے بھی ممنوع ہے، اِس لیے کہ سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ نے اِس کی ہدایت اُنھیں الگ فرما دی ہے۔ یہاں اتنی بات مزید واضح ہوئی کہ اجنبی مردوں کے سامنے زیب و زینت کی نمایش جاہلیت کا طریقہ ہے، اِس کا اسلامی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۶۴۔ یعنی گھروں میں رہ کر اِنھی کاموں میں سرگرم رہو تاکہ اپنی وہ ذمہ داری کماحقہٗ پوری کر سکو جو رسول

الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ وَيُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِيۡرًا ﴿۳۳﴾ وَاذۡكُرۡنَ مَا يُتۡلٰى فِىۡ بُيُوۡتِكُنَّ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالۡحِكۡمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيۡفًا خَبِيۡرًا ﴿۳۴﴾

گھر کی بیبیو کہ تم سے (وہ) گندگی دور کرے (جو یہ منافق تم پر تھوپنا چاہتے ہیں) اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔[۶۵] اور تمھارے گھروں میں اللہ کی آیتوں اور اُس کی حکمت کی جو تعلیم دی جاتی ہے، اُس کا چرچا کرو۔[۶۶] بے شک، اللہ بڑا ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔[۶۷] ۳۳-۳۴

کی بیویوں کی حیثیت سے تم پر عائد ہوتی ہے۔ آگے وضاحت فرما دی ہے کہ یہ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ہے جس کے لیے علما اُٹھیں یا پیغمبر کے گھرانے کے لوگ، اُنھیں سب سے بڑھ کر انھی چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

۶۵۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے باطن کی پاکیزگی میں شبہ نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ تمھارے منصب کے لحاظ سے تمھیں لوگوں کی نگاہ میں بھی ہر طرح کی اخلاقی نجاست سے بالکل پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو نہایت شفقت و محبت کے ساتھ خطاب کر کے یہ اب اُن ہدایات کا مقصد بتایا ہے جو اُنھیں یہاں دی جا رہی ہیں اور اُن کے لیے 'اہل بیت' کا لفظ استعمال کر کے واضح کر دیا ہے کہ اِس کا شرف اصلاً اُنھی کو حاصل ہے۔ دوسروں کی شمولیت اِس میں ہو سکتی ہے تو اصلاً نہیں، بلکہ تبعاً و ضمناً ہو سکتی ہے۔

۶۶۔ یعنی جو آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی اور اُن کے ذریعے سے ایمان و اخلاق کے جو حقائق واضح کیے جاتے ہیں، اُن کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس طرح مردوں کی رہنمائی کے لیے ہوئی تھی، اُسی طرح عورتوں کے لیے بھی ہوئی تھی۔ آپ جس طرح باہر لوگوں کو تعلیم دیتے رہتے تھے، اُسی طرح اپنے گھروں کے اندر بھی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ وحی جس طرح باہر آپ پر نازل ہوتی تھی، اُسی طرح گھر کے اندر بھی نازل ہوتی تھی۔ نیز جس طرح آپ کا ہر قول لوگوں کے لیے تعلیم و ہدایت تھا، اُسی طرح آپ کا ہر فعل بھی لوگوں کے لیے اسوہ و نمونہ تھا۔ آپ کی زندگی 'پرائیویٹ' اور 'پبلک' کے الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں تھی، بلکہ آپ کی حیات مبارک کا ہر لمحہ امت کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف تھا، اِس وجہ سے ضروری ہوا کہ جس طرح آپ کی باہر کی زندگی کی ایک ایک ادا کو محفوظ کرنے کے لیے آپ کے جاں نثار سایے کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ رہیں، اُسی طرح آپ کے گھر کے اندر کی زندگی کا بھی ایک ایک پہلو محفوظ رکھنے

www.al-mawrid.com www.javedahmedghamidi.com

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ
وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ

(تاہم اُس کا تمام فضل و رحمت صرف اِسی گھر کے ساتھ خاص نہیں ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ جو مرد اور جو عورتیں مسلمان ہیں،[۶۸] مومن ہیں،[۶۹] بندگی کرنے والے ہیں،[۷۰] سچے ہیں،[۷۱] صبر کرنے

کا انتظام ہو۔ یہ کام، ظاہر ہے کہ آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن ہی کے ذریعے سے ممکن تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم و عمل جتنا آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ذریعے سے پھیلا ہے، اُس کی مقدار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعے پھیلے ہوئے علم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اور اِس آیت سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اِس مشن پر آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو اللہ تعالیٰ نے خود مامور فرمایا تھا کہ اُن کا کام دنیا کے خزف ریزے جمع کرنا نہیں، بلکہ علم و حکمت کے اُن خزانوں کو خلق کے اندر لٹانا ہے جن کی بارش اُن کے گھروں کے اندر ہو رہی ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۲۲۳)

۶۷۔ چنانچہ کوئی گھر کے اندر ہو یا باہر، اُس کی کوئی خدمت اُس سے مخفی نہیں رہتی۔ وہ اُس کا صلہ دنیا اور آخرت میں ضرور دیتا ہے۔

۶۸۔ یعنی جنھوں نے اسلام کو اپنے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ 'اسلام' کا لفظ جب اِس طریقے سے 'ایمان' کے ساتھ آتا ہے، جس طرح یہاں آیا ہے تو اِس سے دین کا ظاہر مراد ہوتا ہے، یعنی اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینے کی وہ کیفیت جو انسان کے قول و فعل اور اعضا و جوارح سے نمایاں ہوتی ہے اور اُس کو دیکھ کر ہر شخص جان لیتا ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کو اُس نے پوری طرح اختیار کر لیا ہے، اُس کی زندگی کا کوئی گوشہ اب اُس سے باہر نہیں ہے۔

۶۹۔ ایمان دین کا باطن ہے اور یہاں اِس سے مراد وہ یقین ہے جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے وعدوں کے بارے میں اُس کی حقیقی معرفت کے ساتھ پایا جائے۔ چنانچہ جو خدا کو اِس طرح مانے کہ تسلیم و رضا کے بالکل آخری درجے میں اپنے دل و دماغ کو اُس کے حوالے کر دے، قرآن اپنی اصطلاح میں اُسے مومن کہتا ہے۔

۷۰۔ اصل میں لفظ 'قُنُوْت' استعمال ہوا ہے۔ یہ وہ قلبی کیفیت ہے جو انسان کو پورے اخلاص اور یک سوئی کے ساتھ دائماً اپنے پروردگار کی اطاعت پر قائم رکھتی ہے۔ بندۂ مومن کے نہاں خانۂ وجود میں عبد و معبود کے

www.javedahmadghamidi.com

وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ

والے ہیں،[۷۲] اللہ کے آگے جھک کر رہنے والے ہیں،[۷۳] خیرات کرنے والے ہیں،[۷۴] روزہ رکھنے

تعلق کا سب سے نمایاں ظہور یہی ہے۔ چنانچہ 'قٰنِتِیْن' وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ بندگی میں رہیں۔ غم، خوشی، جوش، ہیجان اور لذت والم کی کسی حالت میں بھی اپنے خالق سے سرکش نہ ہوں۔ شہوت کا زور، جذبات کی یورش اور خواہشوں کا ہجوم بھی اُنھیں خدا کے سامنے کبھی بے ادب نہ ہونے دے۔ اُن کا دل خدا کا عرش ہو اور اُس کی شریعت کو وہ حضوری میں دیا گیا حکم سمجھیں جس سے سرتابی کا تصور بھی دربار میں کھڑا ہوا کوئی شخص نہیں کر سکتا۔

۷۱۔ یعنی قول و فعل اور ارادہ، تینوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ قرآن نے اِس کے ضد کردار کو نفاق اور اِسے اخلاص سے تعبیر کیا ہے۔

۷۲۔ نفس کو اضطراب اور بے چینی سے روک لیا جائے تو عربی زبان میں اِسے صبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اِس کا ابتدائی مفہوم ہے۔ پھر اِسی سے مشکلات اور موانع کے علی الرغم پامردی، استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہنے کے معنی اِس میں پیدا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ آیت میں جس صبر کا ذکر ہے، وہ عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جسے بے بسی اور درماندگی کی حالت میں مجبوراً اختیار کیا جائے، بلکہ عزم و ہمت کا سرچشمہ اور تمام سیرت و کردار کا جمال و کمال ہے۔ اِس سے انسان میں یہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے ناخوش گوار تجربات پر شکایت یا فریاد کرنے کے بجاے وہ اُنھیں رضا مندی کے ساتھ قبول کر لے اور خدا کی طرف سے مان کر اُن کا استقبال کرے۔ اِس مفہوم کے لحاظ سے 'صَابِر' وہ شخص ہے جو ہر خوف و طمع کے مقابل میں اپنے موقف پر قائم اور اپنے پروردگار کے فیصلوں پر راضی اور مطمئن رہے۔

۷۳۔ آیت میں اِس کے لیے 'خٰشِعِیْن' کا لفظ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور اُس کی عظمت و جلال کے صحیح تصور سے جو تواضع، عجز اور فروتنی انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے، قرآن اُسے خشوع سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ ایک قلبی کیفیت ہے جو اُسے خدا کے سامنے بھی جھکاتی ہے اور دوسرے انسانوں کے لیے بھی اُس کے دل میں رحمت و رأفت کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔

۷۴۔ اللہ کی راہ میں انفاق کا ایک درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مال میں سے فرض زکوٰۃ ادا کرتا رہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں سے زیادہ جو کچھ ہو، اُسے معاشرے کا حق سمجھے اور جب کوئی

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

والے ہیں،[۷۵] اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں[۷۶] اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے ہیں،[۷۷] اللہ نے اُن کے لیے بھی مغفرت اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔[۷۸] ۳۵

مطالبہ سامنے آئے تو اُسے فراخ دلی کے ساتھ پورا کرے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کو دبا کر اور اپنی ضرورتوں میں ایثار کر کے بھی وہ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرے۔ خیرات کرنے والوں کی تعبیر اِن سب صورتوں کو شامل ہو سکتی ہے، لیکن بیان اوصاف کے موقع پر جب کسی شخص کو 'مُتَصَدِّق' کہا جائے گا تو اِس سے اشارہ اصلاً اُس کے درجۂ کمال کی طرف ہو گا، یعنی جو سخی اور فیاض ہو اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دے۔ بندوں کے تعلق سے یہ اُسی خشوع کا اظہار ہے جو اِس سے پہلے مذکور ہے۔ نماز اور انفاق کا ذکر قرآن میں اِسی بنا پر ساتھ ساتھ آتا ہے۔

۷۵۔ یہ ضبط نفس اور تربیت صبر کی خاص عبادت ہے۔ قرآن میں اِس کا مقصد یہ بیان ہوا ہے کہ اِس سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ 'صَآئِمِیْن' سے مراد وہ لوگ ہیں جو تقویٰ کے ایسے حریص ہیں کہ اِس کے لیے زیادہ تر روزے سے رہتے ہیں۔ اِس سے یہ بات آپ سے آپ معلوم ہوئی کہ وہ منکرات سے بچتے، فواحش سے اجتناب کرتے اور اپنی زندگی میں تمام اخلاق عالیہ کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں۔

۷۶۔ یہ ضبط نفس اور تقویٰ کا ثمر ہے۔ برہنگی، عریانی اور فواحش سے اجتناب کرنے والوں کے لیے یہ تعبیر قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی عفت و عصمت کی بالکل آخری درجے میں حفاظت کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے جہاں اجازت دی ہے، اُس کے سوا خلوت و جلوت میں اپنا ستر وہ کسی کے سامنے نہیں کھولتے اور نہ کوئی ایسا لباس کبھی پہنتے ہیں جو اُن اعضا کو نمایاں کرنے والا ہو جو اپنے اندر کسی بھی لحاظ سے جنسی کشش رکھتے ہیں۔ فواحش سے اجتناب کا یہی درجہ ہے جس سے وہ تہذیب پیدا ہوتی ہے جس میں حیا فرماں روائی کرتی اور مرد و عورت، دونوں اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ کھولنے کے بجائے، جہاں تک ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھنے کے لیے مضطرب ہوتے ہیں۔

۷۷۔ بندۂ مومن کے دل میں جب اپنے پروردگار کا خیال پوری طرح بس جاتا ہے تو پھر وہ مقررہ اوقات میں کوئی عبادت کر لینے ہی کو کافی نہیں سمجھتا، بلکہ ہمہ وقت اپنی زبان کو خدا کے ذکر سے تر رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی دیکھتا ہے تو 'سبحان اللہ' کہتا ہے۔ کسی کام کی ابتدا کرتا ہے تو 'بسم اللہ' سے کرتا ہے۔ کوئی نعمت پاتا ہے تو 'الحمد للہ' کہہ کر خدا کا شکر بجالاتا ہے۔ 'ان شاء اللہ' اور 'ماشاء اللہ' کے بغیر اپنے کسی ارادے اور کسی عزم کا اظہار نہیں کرتا۔ اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد چاہتا ہے۔ ہر آفت آنے پر اُس کی رحمت کا طلب گار ہوتا ہے۔ ہر مشکل میں اُس سے رجوع کرتا ہے۔ سوتا ہے تو اُس کو یاد کرکے سوتا ہے اور اٹھتا ہے تو اُس کا نام لیتے ہوئے اٹھتا ہے۔ غرض ہر موقع پر اور ہر معاملے میں اُس کی زبان پر اللہ ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ پھر یہی نہیں، وہ نماز پڑھتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، انفاق کرتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، برائی سے بچتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، اُس کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے اور فوراً اُس سے رجوع کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔

اِس ذکر کی ایک صورت فکر بھی ہے۔ خدا کی اِس دنیا کو دیکھیے تو اِس میں ہزاروں مخلوقات ہیں، اُن کی رنگارنگی اور بوقلمونی ہے، پھر عقل انسانی اور اُس کے کرشمے ہیں، سمندروں کا تلاطم ہے، دریاؤں کی روانی ہے، لہلہاتا سبزہ اور آسمان سے برستا ہوا پانی ہے، لیل و نہار کی گردش ہے، ہوا اور بادلوں کے تصرفات ہیں، زمین و آسمان کی خلقت اور اُن کی حیرت انگیز ساخت ہے، اُن کی نفع رسانی اور فیض بخشی ہے، اُن کی مقصدیت اور حکمت ہے، پھر انفس و آفاق میں خدا کی وہ نشانیاں ہیں جو ہر آن نئی شان سے نمودار ہوتی ہیں۔ بندۂ مومن اِن آیات الٰہی پر غور کرتا ہے تو اُس کے دل و دماغ کو یہ خدا کی یاد سے بھر دیتی ہیں۔ چنانچہ وہ پکار اٹھتا ہے کہ پروردگار، یہ کارخانہ تو نے عبث نہیں بنایا۔ تیری شان علم و حکمت کے منافی ہے کہ تو کوئی بے مقصد کام کرے۔ میں جانتا ہوں کہ اِس جہان رنگ و بو کا خاتمہ لازماً ایک روز جزا پر ہو گا جس میں وہ لوگ عذاب اور رسوائی سے دوچار ہوں گے جو تیری اِس دنیا کو کھلنڈرے کا کھیل سمجھ کر اُس میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُن کے انجام سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔

۷۔۸ انسان کے اخلاقی وجود کا حسن جب خلق اور خالق، دونوں کے معاملے میں درجۂ کمال کو پہنچتا ہے تو اُس سے جو اوصاف پیدا ہوتے ہیں یا قرآن مجید کی رو سے ہونے چاہییں، وہ یہی دس اوصاف ہیں۔ پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اِن پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔ دین کا جمال و کمال قرآن کے نزدیک یہی ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو اِسی تک پہنچنے اور اِسی کو پانے کی دعوت دیتا ہے۔ اِس کا صلہ خدا کی مغفرت اور وہ اجر عظیم ہے جس کی بندۂ مومن تمنا کر سکتا ہے۔ اِس سے آگے اگر کوئی درجہ ہے تو وہ نبوت کا درجہ ہے اور اُس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اخذ و اکتساب کے ذریعے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اللہ ہی نے جس کو چاہا ہے، یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے۔

[باقی]

محمد عمار خان ناصر

”میزان“ — توضیحی مطالعہ

قانون سیاست

(۳)

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے شہریت کے شرائط

”جو لوگ یہ تین شرطیں پوری کر دیں، اِس سے قطع نظر کہ اللہ کے نزدیک اُن کی حیثیت کیا ہے، قانون و سیاست کے لحاظ سے وہ مسلمان قرار پائیں گے اور وہ تمام حقوق اُنھیں حاصل ہو جائیں گے جو ایک مسلمان کی حیثیت سے، اُن کی حکومت میں اُن کو حاصل ہونے چاہییں۔“ (میزان ۴۹۳)

یہاں دو اہم نکات وضاحت کے متقاضی ہیں:

پہلا نکتہ مسلمانوں کی شہریت کے شرائط سے متعلق ہے۔ مذکورہ اقتباس میں مصنف نے اللہ اور رسول پر ایمان لانے اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کرنے والوں کو مسلمان کے طور پر حقوق شہریت حاصل ہونے کی شرط قرار دیا ہے۔ قانون عبادات میں نماز اور زکوٰۃ کے مباحث کے تحت بھی مصنف نے واضح کیا ہے کہ جو مسلمان نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام نہ کریں، وہ مسلمان کی حیثیت سے حقوق شہریت سے بہرہ مند نہیں ہوں گے۔ مصنف کے اس بیان سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ افراد اگر ترک نماز اور ترک زکوٰۃ پر اصرار کریں تو مسلمان ریاست یہ اختیار رکھتی ہے کہ ان کے ساتھ احکام و قوانین کے لحاظ سے وہ معاملہ نہ کیا جائے جو

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

مصنف کے اس نقطۂ نظر کا تقابل اگر فقہا کے موقف سے کیا جائے تو جزوی اتفاق اور جزوی اختلاف کی صورت سامنے آتی ہے۔ فقہا کے نزدیک بھی مسلمانوں کے اولوالامر کو ان سے نماز کی پابندی کا مطالبہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اگر کوئی شخص ترک نماز پر اصرار کرے تو فقہا کا ایک گروہ اس کی تکفیر کرتا اور بربنائے ارتداد اسے سزائے موت کا مستوجب قرار دیتا ہے، جب کہ زیادہ تر فقہا کے نزدیک اس صورت میں اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی، لیکن اسے تعزیراً قتل کیا جا سکتا ہے (ابن قدامہ، المغنی ۳/ ۳۵۱-۳۵۲)۔

اگر کوئی شخص زکوٰۃ کی ادائیگی سے گریزاں ہو تو فقہا ریاست کو اس سے جبراً زکوٰۃ وصول کرنے کا حق دیتے ہیں اور فقہا کا ایک گروہ بعض احادیث کی روشنی میں تعزیراً اس کے اموال واملاک کا کچھ حصہ بحق سرکار ضبط کرنے کو بھی جائز قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی گروہ مجتمع ہو کر اپنی طاقت کے بل بوتے پر ریاست کو زکوٰۃ دینے سے انکار کرے تو سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عمل سے استدلال کرتے ہوئے فقہا اس کے خلاف جنگ کرنے کو بھی مشروع قرار دیتے ہیں۔*

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مصنف کے زاویۂ نظر سے ریاست کو مسلمانوں سے نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا مطالبہ کرنے کا حق تو حاصل ہے، لیکن اس مطالبے سے گریز کرنے والوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ تاہم اس کی پاداش میں ایسے لوگوں کو ان شہری حقوق سے محروم کیا جا سکتا ہے جن سے وہ بطور مسلمان بہرہ مند ہیں۔ مثال کے طور پر ذبیحہ، نکاح وطلاق، تجہیز وتکفین اور وراثت وغیرہ سے متعلق یہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ جو مسلمان نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی پابندی قبول نہ کریں، ان پر مسلمانوں کے احکام کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اسی طرح سیاسی ومعاشرتی معاملات میں انھیں مسلمانوں کی نمایندگی کا حق نہیں دیا جائے گا۔

مصنف کے اس موقف سے ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا ایسے لوگ دائرۂ اسلام سے خارج سمجھے جائیں گے؟ اسلام کی طرف نسبت کا دعویٰ کرنے والوں کی تکفیر سے متعلق مصنف کے اصولی موقف سے بظاہر اس کی نفی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں کلمہ گو کی تکفیر کے حوالے سے مصنف کے نقطۂ نظر میں ارتقا کو پیش نظر رکھنا اہم ہے۔ ۱۹۹۰ء میں ''دعوت کے حدود'' کے عنوان سے لکھی گئی ایک تحریر میں مصنف نے کسی شخص کی تکفیر اور اسے غیر مسلم قرار دینے میں فرق کیا ہے اور تکفیر کے جواز کی نفی کرتے ہوئے بعض حالات میں کسی مسلمان کو

* تفصیل کے لیے دیکھیے: یوسف القرضاوی، فقہ الزکاۃ ۸۷-۹۷۔

غیر مسلم قرار دینے کی گنجایش تسلیم کی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

”کسی فرد کی تکفیر کا حق بھی کسی داعی کو حاصل نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دین سے جہالت کی بنا پر مسلمانوں میں سے کوئی شخص کفر و شرک کا مرتکب ہو، لیکن وہ اگر اِس کو کفر و شرک سمجھ کر خود اِس کا اقرار نہیں کرتا تو اِس کفر و شرک کی حقیقت تو بے شک، اُس پر واضح کی جائے گی، اِسے قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ ثابت بھی کیا جائے گا، اہل حق اِس کی شناعت سے اُسے آگاہ بھی کریں گے اور اِس کے دنیوی اور اخروی نتائج سے اُسے خبر دار بھی کیا جائے گا، لیکن اُس کی تکفیر کے لیے چونکہ اتمام حجت ضروری ہے، اِس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ حق اب قیامت تک کسی فرد یا جماعت کو بھی حاصل نہیں رہا کہ وہ کسی شخص کو کافر قرار دے۔ مسلمانوں کا نظم اجتماعی بھی سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۵ اور ۱۱ کے تحت زیادہ سے زیادہ کسی شخص یا گروہ کو غیر مسلم قرار دے سکتا ہے، اُسے کافر قرار دینے کا حق اُسے بھی حاصل نہیں ہے۔“

(برہان ۳۱۹)

تاہم بعد کی تحریروں میں مصنف نے اپنا جو نقطۂ نظر بیان کیا ہے، اس کی رو سے کسی کلمہ گو مسلمان کو غیر مسلم بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ ”مقامات“ میں ”مسلم اور غیر مسلم“ کے زیر عنوان مصنف نے لکھا ہے:

”اِس کے بعد اُن لوگوں کا معاملہ ہے جو مسلمان ہیں، اپنے مسلمان ہونے کا اقرار، بلکہ اُس پر اصرار کرتے ہیں، مگر کوئی ایسا عقیدہ یا عمل اختیار کر لیتے ہیں جو عام طور پر اسلام کی تعلیمات کے منافی سمجھا جاتا ہے یا کسی آیت یا حدیث کی کوئی ایسی تاویل اختیار کر لیتے ہیں جسے کوئی عالم یا علما یا دوسرے تمام مسلمان بالکل غلط سمجھتے ہیں، مثلاً امام غزالی اور شاہ ولی اللہ جیسے بزرگوں کا یہ عقیدہ کہ توحید کا منتہاے کمال وحدت الوجود ہے یا محی الدین ابن عربی کا یہ نظریہ کہ ختم نبوت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نبوت کا مقام اور اُس کے کمالات ختم ہو گئے ہیں، بلکہ صرف یہ ہیں کہ اب جو نبی بھی ہو گا، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا پیرو ہو گا یا اہل تشیع کا یہ نقطۂ نظر کہ مسلمانوں کا حکمران بھی مامور من اللہ ہوتا ہے جسے امام کہا جاتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اِس منصب کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا تقرر اِسی اصول کے مطابق خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے کر دیا گیا تھا جسے قبول نہیں کیا گیا یا علامہ اقبال جیسے جلیل القدر مفکر کی یہ راے کہ جنت اور دوزخ مقامات نہیں، بلکہ احوال ہیں۔

یہ اور اِس نوعیت کے تمام نظریات و عقائد غلط قرار دیے جا سکتے ہیں، اِنھیں ضلالت اور گم راہی بھی کہا جا سکتا ہے، لیکن اِن کے حاملین چونکہ قرآن و حدیث ہی سے استدلال کر رہے ہوتے ہیں، اِس لیے اُنھیں

غیر مسلم یا کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اِن نظریات و عقائد کے بارے میں خدا کا فیصلہ کیا ہے؟ اِس کے لیے قیامت کا انتظار کرنا چاہیے۔ دنیا میں اِن کے حاملین اپنے اقرار کے مطابق مسلمان ہیں، مسلمان سمجھے جائیں گے اور اُن کے ساتھ تمام معاملات اُسی طریقے سے ہوں گے، جس طرح مسلمانوں کی جماعت کے ایک فرد کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ علما کا حق ہے کہ اُن کی غلطی اُن پر واضح کریں، اُنھیں صحیح بات کے قبول کرنے کی دعوت دیں، اُن کے نظریات و عقائد میں کوئی چیز شرک ہے تو اُسے شرک اور کفر ہے تو اُسے کفر کہیں اور لوگوں کو بھی اُس پر متنبہ کریں، مگر اُن کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ مسلمان نہیں رہے یا اُنھیں مسلمانوں کی جماعت سے الگ کر دینا چاہیے، اِس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اِس لیے کہ یہ حق خدا ہی دے سکتا تھا اور قرآن و حدیث سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اُس نے یہ حق کسی کو نہیں دیا ہے۔"(۲۲۹)

ان تمام بیانات کو اگر ملا کر دیکھا جائے تو مصنف کے نقطۂ نظر کو درج ذیل تین نکات کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مصنف کے نزدیک اصولی طور پر کسی مسلمان کی تکفیر اس کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ خود اسلام سے ترک تعلق کا اعلان کر دے۔

۲۔ اگر کوئی شخص یا گروہ اسلام کے ساتھ نسبت کو قائم رکھے، لیکن عقیدہ و عمل کے لحاظ سے اسلام کے کسی بنیادی حکم سے انحراف کا مرتکب ہو تو اعتقادی انحراف کی صورت میں اس کے ساتھ عملی معاملات مسلمانوں ہی کی طرح کیے جائیں گے، لیکن اس کو کافر یا غیر مسلم قرار نہیں دیا جائے گا۔

۳۔ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی نہ کرنے والے مسلمانوں کو ان شہری حقوق سے محروم کیا جا سکتا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ خاص ہیں، تاہم ایسے لوگوں پر عملاً مسلمانوں کے احکام جاری نہ کرنے کے باوجود جب تک کہ وہ اقرار شہادتین پر قائم رہیں، ان کی قانونی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

دوسرے اہم نکتے کا تعلق اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی شہریت سے ہے۔ مصنف نے یہاں صرف مسلمان شہریوں کے حقوق شہریت کے ذکر پر اکتفا کی ہے، جب کہ غیر مسلموں کی شہریت کے شرائط کو موضوع نہیں بنایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف کے نقطۂ نظر سے شریعت میں ایسی کوئی ہدایات موجود نہیں ہیں جو ابدی ہوں اور جن کی پابندی مسلمانوں کے لیے ہمیشہ ضروری ہو۔ اس ضمن میں عہد رسالت کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے متعلق جو احکام دیے گئے، مصنف کے نزدیک وہ قانون رسالت پر مبنی تھے اور ان کا براہ راست

اطلاق انھی اقوام پر ہوتا تھا جن پر ان کے نفاذ کی ہدایت اللہ تعالیٰ یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ اس خاص دور کے گزر جانے کے بعد ان کا نفاذ مصنف کے نزدیک درست نہیں۔ چنانچہ ''مقامات'' میں ''جہاد و قتال'' کے زیر عنوان مصنف نے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پہلی صورت کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے جو اِس دنیا میں ہمیشہ اُس کے براہ راست حکم سے اور اُنھی ہستیوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنھیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ منصب آخری مرتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا ہے۔ اِس قانون کے تحت آپ نے اور آپ کے صحابہ نے کفر کے خلاف جو جنگیں لڑی ہیں، وہ محض جنگیں نہ تھیں، بلکہ خدا کا عذاب تھا جو سنت الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلۂ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر اور اِس کے بعد جزیرہ نمائے عرب سے باہر کی بعض قوموں پر نازل کیا گیا۔ آپ پر نبوت ختم کر دی گئی ہے۔ چنانچہ لوگوں کے خلاف محض اُن کے کفر کی وجہ سے جنگ اور اِس کے نتیجے میں مفتوحین کو قتل کرنے یا اُن پر جزیہ عائد کر کے اُنھیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق بھی آپ اور آپ کے صحابہ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اِس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اُس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔''(۲۶۰)

اس خاص تناظر سے ہٹ کر، مسلمان ریاست میں مقیم غیر مسلموں کے حقوق و فرائض کے تعین کا مسئلہ مصنف کے نزدیک اجتہاد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ضمن میں مصنف کی تحریروں میں ایک رائے یہ ملتی ہے کہ میثاق مدینہ میں یہودیوں کو جو سیاسی حیثیت دی گئی، وہ ایک عمومی اصول کے طور پر مسلم ریاست کے لیے ''بہترین نمونہ'' کی حیثیت رکھتی ہے (میزان، ص ۴۹۱، طبع نہم، مئی ۲۰۱۴ء)۔ تاہم ۲۰۱۵ء میں مصنف نے پاکستان میں دہشت گردوں کے بیانیے کے حوالے سے جاری بحث میں ایک متبادل بیانیہ پیش کیا تو اس میں ریاست کے قدیم تاریخی تصورات اور جدید قومی ریاست کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا کہ:

''دور حاضر کی قومی ریاستیں جن کے حدود بین الاقوامی معاہدات سے متعین ہوتے اور جو وجود میں آتے ہی اپنے باشندوں کے لیے بنائے قومیت بن جاتی ہیں۔ لہٰذا رنگ، نسل، زبان، مذہب اور تہذیب و ثقافت کے اشتراک و اختلاف سے قطع نظر وہ اپنے آپ کو ہندی، مصری، امریکی، افغانی اور پاکستانی کہتے اور اپنی قومیت کا اظہار اِسی حوالے سے کرتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی کسی کا حاکم یا محکوم نہیں ہوتا، بلکہ سب ہر لحاظ سے برابر کے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شہری سمجھے جاتے ہیں اور اِسی حیثیت سے کاروبار حکومت میں شریک ہوتے ہیں۔

دور حاضر کی یہی ریاستیں ہیں جن کے بارے میں میں نے لکھا ہے کہ اِن کا کوئی مذہب نہیں ہو سکتا۔ ریاست پاکستان اِسی نوعیت کی ایک ریاست ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اِس کے لیے نہ کوئی فرمان آسمان سے نازل ہوا ہے کہ جزیرہ نماے عرب کی طرح یہ صرف مسلمانوں کا ملک ہے، نہ مسلمانوں نے اِس کو فتح کر کے اِس میں رہنے والے غیر مسلموں کو اپنا محکوم بنا لیا ہے اور نہ وہ اُن کے ساتھ کسی معاہدے کے نتیجے میں اِس ریاست کے شہری بنے ہیں۔ وہ صدیوں سے اِسی سر زمین کے باشندے ہیں، جس طرح مسلمان اِس کے باشندے ہیں اور ریاست جس طرح مسلمانوں کی ہے، اُسی طرح اُن کی بھی ہے۔''(مقامات ۲۱۰)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خورشید احمد ندیم

سید مودودی، سید قطب اور علی گڑھ

علی گڑھ یونیورسٹی کا فیصلہ ہے کہ سید مودودی اور سید قطب، اب اس کے نصاب کا حصہ نہیں ہوں گے۔ مجھے حیرت ہو گی اگر یونیورسٹی کی انتظامیہ کسی احساس شرمندگی کے بغیر اس فیصلے پر قائم رہتی ہے۔ ان اسکالرز پر بھی حیرت ہو گی جو اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیں گے۔ صد حیرت ہو گی، اگر عالمی سطح پر بھی یونیورسٹی کے اس فیصلے کو قبول کر لیا جاتا ہے۔

نصاب سے اخراج کا یہ مطلب نہیں کہ ان مفکرین کے خیالات کا مطالعہ، فکر اسلامی کے طلبا کے لیے اس سے پہلے لازم تھا اور اب نہیں رہا۔ طلبا و طالبات ان اہل علم کے افکار کو بطور اختیاری مضمون پڑھ سکتے تھے۔ اب وہ اس کا حق نہیں رکھتے۔ میرا احساس ہے کہ اتنا بڑا فیصلہ، ایک یونیورسٹی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویٰ رکھنے والی کسی مملکت کے لیے کسی طور قابل دفاع نہیں۔ آزادی راے پر پابندی کی یہ بد ترین صورت ہے جو شاید چین جیسے کسی ملک ہی میں گوارا ہو سکتی ہے۔

پابندی کا محرک بظاہر ایک خط ہے جو کسی سماجی کارکن سے منسوب ہے۔ پس منظر میں، مگر وہ سوچ ہے جو بھارت کو آہستہ آہستہ ایک ہندو ریاست بنا دینا چاہتی ہے۔ 'ہندو ریاست'، اسلامی ریاست کی طرح کوئی علمی حقیقت نہیں۔ تصور ریاست کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک ریاست کے تمام نقوش کو واضح کرتا ہو۔ ہم اس سے اختلاف کر سکتے ہیں، مگر ریاست کا ایک وجود لازم ہے جو علمی اور خیالی ہی کیوں نہ ہو۔ مثال کے طور پر خلافت، ایک نظام ریاست ہے جسے بیان کیا جا سکتا ہے اور تاریخ نے اس کے خد و خال کو اپنے اوراق میں محفوظ بھی کر رکھا ہے۔ علم کی دنیا 'ہندو ریاست' کے کسی تصور سے خالی ہے۔

جسے ہندو ریاست کہا جاتا ہے، وہ دراصل ایک ایسا حکومتی بندوبست ہے جس میں ریاست کے تمام معاملات میں ہندو بالا دست ہوں۔ 'ہندوتوا' یہی ہے۔ وہ چاہیں تو کسی مسجد کو ڈھا دیں، اس مفروضے کے تحت کہ یہاں ماضی میں کوئی مندر تھا۔ ہندو ریاست میں ہندو کا حق فائق ہے۔ عدالت کو اس کا دعویٰ تسلیم کرنا چاہیے۔ اسی اصول پر شہروں کے نام تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ ہر وہ خیال اور تصور قابل قبول نہیں جو ہندوؤں کے اس حق کو چیلنج کرتا ہو یا اس کے برخلاف ریاست کا کوئی تصور دیتا ہو۔ سیکولرزم بھی اسی لیے قابل قبول نہیں۔ اگر ہوتا تو بھارت پہلے ہی ایک سیکولر ملک ہے۔ اسے 'ہندوتوا' نام کی کسی نئی سیاسی شناخت کی ضرورت نہیں تھی۔

یہ رویہ کتنا غیر علمی اور غیر عملی ہے، علی گڑھ یونیورسٹی کا یہ فیصلہ اس کا ایک مظہر ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بیسویں صدی کے سب سے موثر مسلمان مفکر ہیں۔ ان کی علمی وجاہت کا انکار اپنی جگہ ایک جہالت ہے۔ علوم اسلامی سے لے کر فکر اسلامی تک، انھوں نے ہر گوشۂ خیال کو متاثر کیا۔ ایک یونیورسٹی کے شعبۂ علوم اسلامی کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کے افکار سے صرف نظر کر سکے۔ یہی معاملہ سید قطب کا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں جس نے مسلمانوں کی تین نسلوں کو اپنی فکری گرفت میں رکھا ہے، اس کی اثر انگیزی کا انکار محال ہے۔

ہندوستان کے پس منظر میں تو مولانا مودودی کی اہمیت اضافی ہے۔ انھوں نے اس سرزمین پر جنم لیا۔ اس کی زبان کو ابلاغ کا ذریعہ بنایا اور اس میں کیا شبہ ہے کہ اسے مالا مال کر دیا۔ مولانا نے ۱۹۴۱ء میں ایک جماعت قائم کی۔ یہ جماعت آج ان تینوں ممالک میں موجود ہے جو اُس وقت ایک ملک تھے۔ جماعت اسلامی بھارت میں ہمیشہ سے متحرک ہے، بلکہ اس کی تاریخ، جدید بھارت سے قدیم تر ہے۔ جماعت اسلامی ہند نے کبھی کوئی ایسی حکمت عملی نہیں اپنائی جو بھارت کے آئین کے خلاف ہو۔ یہ جماعت، مولانا مودودی کی تعبیر دین پر کھڑی ہے۔ جماعت سے ریاست کو کبھی شکایت نہیں رہی۔ سوال یہ ہے کہ اب مولانا مودودی کے افکار ناقابل قبول کیوں ہو گئے؟

پھر اس فیصلے کا ایک اور پہلو ہے جو زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر جب کسی صاحب علم کے افکار زیر بحث آتے ہیں تو اس کا مقصود تنقیدی مطالعہ ہوتا ہے۔ ان کی تائید لازم ہوتی ہے، نہ تردید۔ سرمایہ دارانہ دنیا کے ہر ملک میں مارکس کو پڑھایا جاتا ہے۔ بلکہ امریکا اور برطانیہ کے کئی بڑے تعلیمی ادارے تو کمیونسٹوں کے قبضے میں ہیں۔ وہاں آئے دن اشتراکیت پر تحقیق ہو رہی ہے اور کتابیں چھپ رہی ہیں۔ کہیں سرمایہ دار ملکوں

نے مارکس اور اینجلز پر پابندی لگا دی؟

میرے ایک صحافی دوست ایک زمانے میں عمران خان صاحب کے میڈیا کنسلٹنٹ تھے۔ اُس وقت جمائما صاحبہ بھی پاکستان میں تھیں۔ میرے دوست برطانیہ کی ایک یونیورسٹی میں اپنے بیٹے کا داخلہ چاہتے تھے۔ ایسے داخلوں کے لیے طالب علم کو دو معروف لوگوں کا حوالہ (reference) دینا ہوتا ہے۔ انھوں نے عمران خان سے کہا کہ اس کے لیے جمائما سے بات کریں۔ اس پر جمائما کا کہنا تھا کہ وہ ایک بڑے سرمایہ دار، گولڈ سمتھ کی بیٹی ہیں۔ اس یونیورسٹی پر کمیونسٹوں کا غلبہ ہے۔ میرا حوالہ فائدے کے بجاے نقصان کا باعث بنے گا۔ جمائما کی بات درست تھی۔ برطانیہ جیسے معاشرے قائم ہی اسی وجہ سے ہیں کہ وہاں فکری آزادی کا احترام کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں بھی بعض اوقات لوگ جامعات کو اپنے افکار کی گرفت میں رکھنا چاہتے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ سب ان کے تہذیبی رویوں کے ناقل ہوں۔ اسی طرح وہی کچھ پڑھایا جائے جو وہ چاہتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک اس سوچ کو انتظامی سطح پر پذیرائی نہیں ملی۔ یونیورسٹی کی سطح پر تحقیق کا دروازہ بند کرنے کا مطلب، معاشرے کو فکری طور پر بانجھ بنانا ہے۔ انتہا پسندی ایسے معاشروں کا مقدر بن جاتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بھارت بہت تیزی کے ساتھ مذہبی انتہا پسندی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ یہ رجحان عوامی نہیں، ریاستی ہے۔ یہ ریاست ہے جو اس راستے پر دوڑے چلی جا رہی ہے۔ مسلم معاشرے آج مثال بن چکے کہ جس سرزمین پر مذہبی انتہا پسندی ہوتی ہے، وہاں خوش حالی کی فصل نہیں اگ سکتی۔ یہ وہ سیم اور تھور ہے جو زمین کی زرخیزی کو کھا جاتی ہے۔ بھارت کو صرف تمام مذاہب کا احترام اور سیکولرزم ہی متحد رکھ سکتا ہے۔ پاکستان، جس کی ستانوے فی صد آبادی مسلمان ہے، آج ایک قومی ریاست کا ماڈل اپنانے پر مجبور ہے تو بھارت کہاں 'ہندوتوا' کے بار کا متحمل ہو سکتا ہے، جہاں بائیس کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ جو گروہ کروڑوں میں ہو، اسے اقلیت نہیں کہا جا سکتا۔

علی گڑھ یونیورسٹی کا فیصلہ ابھی ابتدائی درجے میں نافذ ہوا ہے۔ یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے ابھی اس کی منظوری نہیں دی۔ امید ہے کہ وہاں بیٹھے لوگ اس فیصلے کے اُن مضمرات پر ضرور غور کریں گے جو یونیورسٹی کی ساکھ کے لیے سخت نقصان دہ ہیں۔ میری تجویز ہے کہ یونیورسٹی کے اکابر بھارت کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ خطبۂ صدارت ضرور پڑھیں جو انھوں نے ۲۰/ فروری ۱۹۴۹ء کو یونیورسٹی کے سالانہ

کانووکیشن کے موقع پر دیا تھا۔ مولانا کی اس ادارے کے بارے میں ایک منفرد رائے تھی، مگر واقعہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد اسے زندہ رکھنے میں ان کا بڑا کردار ہے۔ وہی تھے جنھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو اس کا وائس چانسلر بننے پر آمادہ کیا۔

بھارت میں برصغیر کی مسلم روایت کی حفاظت، علی گڑھ یونیورسٹی کے فرائض میں سے ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کے منتظمین اپنے اکابر کی طرح ہندو اکثریت کے جبر کا جرأت کے ساتھ سامنا کریں گے۔ اسی میں بھارت کی بھلائی ہے۔

(بشکریہ: روزنامہ دنیا، لاہور، ۶/ اگست ۲۰۲۲ء)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اشراق

ڈاکٹر عرفان شہزاد

اوائل عمر میں تصور خدا کی تشکیل میں والدین اور اساتذہ کے شخصی اثرات

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

["نقطۂ نظر" کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

بچے کے ذہن میں خدا کا ابتدائی تصور عموماً اس کے ماں، باپ اور اساتذہ کی شخصیات سے ماخوذ ہوتا ہے۔ ان ابتدائی تصورات کا تاثر اکثر اتنا گہرا اور پختہ ہوتا ہے کہ تمام عمر کے لیے خدا کے ساتھ ذاتی تعلق کی نوعیت طے کر دیتا ہے۔ ان شخصیات کے ساتھ شفقت، محبت، احترام، خوف، اطاعت اور نفرت کے عناصر، خدا کے ساتھ تعلق کے ذاتی احساس میں بغیر کسی شعوری کوشش کے پیوست ہو جاتے ہیں۔

ناظرہ قرآن کی ہماری استانی میرے لیے ایسی ہی ایک شخصیت تھیں۔ وہ محلے کی ایک بزرگ خاتون تھیں۔ انھیں بُوا جی کہتے تھے۔ وہ بڑے جثے کی ایک رعب دار خاتون تھیں۔ گھر کے کام کرتے کرتے ہمیں سبق بھی پڑھاتی جاتی تھیں۔ دل کی نرم اور زبان کی سخت تھیں۔ انھیں کبھی مارتے نہیں دیکھا تھا، اس کے باوجود ان سے ڈر لگتا تھا۔ ان میں بچوں کے لیے دبی دبی شفقت محسوس ہوتی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو میرے دل میں ان سے ڈر نہیں تھا، حیا تھی۔ چھٹی کر لیتا تو ان کا سامنا کرنے میں ڈر سے زیادہ شرمندگی محسوس ہوتی تھی اور شرمندگی کا یہ احساس میرے لیے ڈر سے زیادہ بھاری تھا۔

میرا تصور خدا بُوا جی جیسا تھا۔ ایک عظیم الجثہ ہستی جو اپنے کام کرتے کرتے کائنات کا انتظام بھی دیکھتی جاتی ہے۔ جو پردے میں رہ کر اپنے بندوں پر اپنی شفقت کا اظہار کرتی ہے۔ خدا سے مجھے ڈر سے زیادہ حیا آتی ہے۔ علم و آگہی کے ورود کے بعد خدا کا تصور بہت کچھ بدل گیا، لیکن حیا نما ڈر کا تاثر آج بھی ویسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

علم نفسیات کے مطابق بچہ اپنے لیے خدا کا پہلا تصور اپنے والدین سے اخذ کرتا ہے۔ پہلے ماں کی مہربان شخصیت سے خدا کا تصور کشید کرتا ہے اور پھر باپ کا تاثر اس کی جگہ لے لیتا ہے، جو ایک مربی اور محافظ کا تاثر ہے۔ باقی ساری عمر وہ اپنے باپ جیسے خدا کا تصور ذہن میں بسائے رکھتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف ماں، باپ ہی نہیں، اساتذہ کی شخصیت کا تاثر بھی خدا کا پہلا تصور قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مسلمان بچے مولوی صاحب اور مسیحی بچے پادری صاحب کو خدا یا خدا کا روپ سمجھ لیتے ہیں۔

علم نفسیات کے مطابق انسان کا بچپن ساری عمر اس کے اندر زندہ رہتا ہے۔ یہ بات افراد ہی نہیں، اقوام کے لیے بھی درست ہے۔ افراد اور اقوام کے مزاج اور نفسیات کے درست مطالعے کے لیے ان کے بچپن اور قومی تشخص کی تشکیل کے دور کا مطالعہ اہم ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی فرد یا قوم کے دینی مزاج کے تشکیلی دور میں داخل ہو جانے والے تصور خدا کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً ہر مذہبی روایت نے مادری اور پدری اصطلاحات میں خدا کے تصور کو پیش کیا۔ مسیحیت میں خدا کے لیے 'باپ' ہی کا لفظ اختیار کر لیا گیا۔ ہندو مت میں دیوتا، باپ جیسی اور دیویاں ماں جیسی ہستیاں مانی جاتی ہیں۔ دین اسلام کی روایت میں مخلوق کو "اللہ کا کنبہ" کہا گیا ہے۔ خدا کے لیے 'رب' کا لفظ اختیار کیا گیا جو باپ اور سرپرست کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ ہم اپنے لیے فرزندان توحید اور فرزندان اسلام کی تعبیر اختیار کرتے ہیں۔ خدا کی محبت کا اندازہ ستر ماؤں کی محبت کے پیمانے سے بیان کیا جاتا ہے۔

ہمارے سماج میں علاقائی لحاظ سے دو بڑی مذہبی سماجی روایات پائی جاتی ہیں: ایک پختون علاقوں کی روایت؛ دوسری ہندوستانی علاقوں سے آنے والی روایت۔ پختون روایت میں باپ ایک سخت گیر شخصیت ہوتا ہے۔ اولاد سے اس کا تعلق ڈر، احترام اور اطاعت کے عناصر پر مشتمل ہوتا ہے۔ محبت فطری طور پر موجود ہوتی ہے، لیکن جذباتی حد کو نہیں چھوتی اور دائرۂ اظہار میں نہیں آتی۔ ادھر حفظ و ناظرہ قرآن کے لیے ہر بچہ مدرسے یا مسجد میں قاری اور حافظ صاحبان سے دوبدو ہوتا ہے۔ یہاں اساتذہ میں بھی عمومی طور پر سختی پائی جاتی ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ اور زدوکوب کا رواج ہے۔ اساتذہ کے ساتھ تعلق ادب، احترام، اطاعت، خوف، خدشے، بے زاری، لاتعلقی اور

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بعض صورتوں میں ظالم اور مظلوم کا ہوتا ہے۔

کم سنی میں مدارس میں داخل کرا دیے جانے والے بچے والدین سے دور رہنے کی وجہ سے ان کے ساتھ اپنا جذباتی تعلق پوری طرح استوار نہیں کر پاتے۔ والدین اور اساتذہ کے ساتھ تعلق کا یہ تاثر خدا کا تاثر تشکیل دیتا ہے اور اس تاثر میں خدا سے بھی جذباتی تعلق کم زور ہوتا ہے۔ اس میں بھی بے زاری، لا تعلقی، بلکہ توحش کے احساسات بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ بچے جو والدین کی شفقت، محبت اور ان کی دیکھ بھال کے بغیر جینا سیکھ لیتے ہیں، خدا کی محبت، رحمت اور اس کے سامنے اپنی محتاجی کے احساس سے بھی بڑی حد تک آزاد ہوتے ہیں۔ یہ ایک بڑی اور بنیادی وجہ ہے کہ ہم اپنے معاشرے کے روایتی دینی طبقے میں دین پر عمل کے میدان میں ایک طرف خدا سے محبت اور رحمت کے احساس میں کمی دیکھتے ہیں تو دوسری طرف ایسا قانونی اور فقہی مزاج پاتے ہیں جس کے نزدیک دین پر عمل محض خشک قسم کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے۔ اسلام کے نفاذ میں جو دل چسپی دکھائی دیتی ہے، وہ اس پر عمل کرنے میں نظر نہیں آتی۔ نفاذ اسلام کی کاوشوں میں بھی قانون کا نفاذ، اطاعت، جبر، خوف اور تشدد کے عناصر ملتے ہیں، لیکن رحم دلی، ہم دردی، انسانی مسائل اور مشکلات کا ادراک اور اس کے حل کے لیے کوشش کرنے جیسے عناصر بہ حیثیت طبقہ خاصے کم پائے جاتے ہیں۔

مدارس میں پائی جانے والی دوسری دینی روایت ہندوستانی علاقوں سے پاکستان میں آئی ہے۔ ہندوستانی والدین عموماً سخت گیر نہیں ہوتے۔ اسی طرح ہندوستانی (اور اب پاکستانی) اساتذہ بھی زیادہ سخت گیر نہیں پائے گئے۔ دین کا فقہی اور قانونی پہلو اگرچہ یہاں بھی غالب ہے، لیکن ان کی طرف سے مذہب پر عمل کے معاملے میں تشدد کا رویہ بھی کم ہے۔ صوفیانہ روایت کے تحت خدا کی رحمت اور محبت کا پرچار بھی نسبتاً زیادہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ یہاں آپ کو خدا سے محبت و تعلق کے نمونے بھی زیادہ ملتے ہیں۔

سماج میں ایک تیسری جہت خدا کے تصور کو ماں کے تصور سے اخذ کرنے کی ہے۔ اس کی بنیاد ایک بے اصل روایت پر ہے جس میں ماں کی محبت کو ستر ماؤں کی محبت کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ تاہم بخاری شریف کی ایک صحیح الاسناد روایت میں بیان ہوا ہے کہ ایک عورت، جس کا بچہ گم ہو گیا تھا، اپنی بے تابی میں جو بچہ ملتا اسے سینے سے لگا کر دودھ پلا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے یوں تبصرہ فرمایا:

> ”تم خیال کر سکتے ہو کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ جب تک اس کو قدرت ہو گی، یہ اپنے بچے کو آگ میں نہیں پھینک سکتی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ

اللہ اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ رحم کرنے والا ہے، جتنا یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہو سکتی ہے۔“[1]

اس ارشاد میں مقصود خدا کی رحمت کو ماں کی رحمت سے زیادہ بتانا تھا، نہ کہ خدا کو ماں جیسا جذباتی اور سادہ مزاج بتانا۔ دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خدا رحیم ہے، مگر جذباتی نہیں۔ وہ عدل کے خلاف نہیں کرتا۔ یہ اس کے اصول اور شان کے خلاف ہے، مگر ان روایات کے بل پر خدا کی رحمت سے متعلق جو مبالغہ آمیزی کی گئی، اس نے خدا کے ساتھ دلی محبت کا احساس تو پیدا کیا، مگر خدا کو ایک ماں جیسا جذباتی اور سادہ مزاج بنا کر بھی پیش کر دیا، جس سے جذباتی اپیل کے ذریعے سے عدل و انصاف کے تقاضوں کے برخلاف اپنے گناہوں اور جرائم کی معافی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس تصور نے خدا کی اطاعت اور اس کے احکام پر عمل درآمد سے بے نیازی کا رویہ پیدا کیا اور تقویٰ کی بنیاد ہلا کر رکھ دی۔ ایسے تصورات قرآن مجید میں خدا کے تعارف سے بالکل مختلف، بلکہ متضاد ہیں۔ قرآن مجید خدا کا محفوظ کلام ہے۔ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس طرح کے تمام خارجی تاثرات سے خالی الذہن ہو کر خدا کا وہ تعارف حاصل کرے جو اس نے قرآن مجید میں اپنے بارے میں خود بتایا ہے۔

قرآن مجید کے مطابق، خدا سخت گیر باپ کی طرح ہے نہ کہ تشدد پسند استاد کی طرح، اور نہ ہی وہ ماں جیسی جذباتی طبیعت رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کا رب، ان کا معبود اور ان کا بادشاہ ہے۔[2] وہ رحمٰن و رحیم ہے، اور اسی لیے عادل ہے۔ عدل اس کی رحمت کا نتیجہ ہے۔[3] وہ اگر عدل نہ کرے تو ظالموں پر اس کی رحمت، مظلوم کے حق میں ظلم اور ناانصافی بن جائے، جب کہ خدا ہر ظلم سے بری ہے۔ اس کی رحمت اس کے عدل کے مطابق ہوتی ہے۔

۱۔ رقم ۵۲۲۲۔

۲۔ الناس ۱۱۴: ۱-۳۔ ’قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ. مَلِكِ النَّاسِ. اِلٰهِ النَّاسِ‘، ”تم دعا کرو، (اے پیغمبر) کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے معبود کی۔“

۳۔ الانعام ۶: ۱۲۔ ’كَتَبَ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ؕ لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ‘، ”اُس نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے۔ وہ تم سب کو جمع کر کے ضرور روز قیامت کی طرف لے جائے گا، جس میں کوئی شبہ نہیں۔“

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عدل کا قیام، خدا کی صفت رحمت کا تقاضا ہے۔

وہ خطا میں معقول عذر قبول کرتا ہے،[4] مگر سرکشی کو معاف نہیں کرتا۔ اس نے حدود اللہ سے تجاوز کرنے والے سرکشوں کے لیے ابدی جہنم کی سزا سنائی ہے۔[5] ان میں کافر و مشرک[6] کے علاوہ قاتل[7] بھی شامل ہے۔ یہ اس لیے کہ بے دلیل شرک پر اصرار ہو یا اپنے ضمیر کے خلاف کسی کے ناحق قتل کا جرم یا خدا کے قائم کردہ دیگر حدود سے جان بوجھ کر تجاوز، یہ سب سرکشی کے جرائم ہیں۔ اس لیے ان سب کی سزا بھی ایک ہے۔

ضروری ہے کہ بچپن اور ماحول سے ملے ہوئے تصور خدا کی درستی قرآن مجید کی روشنی میں کی جائے۔ اس کے لیے قرآن مجید کا شعوری مطالعہ ضروری ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۴۔ البقرہ ۲: ۲۸۶۔ 'رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِیۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا'، ''پروردگار، ہم بھول جائیں یا غلطی کر جائیں تو اُس پر ہماری گرفت نہ کر۔''

۵۔ النساء ۴: ۱۴۔ 'وَمَنۡ یَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوۡدَهٗ یُدۡخِلۡهُ نَارًا خَالِدًا فِیۡهَا ۨ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِیۡنٌ'، ''اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کریں گے اور اُس کی ٹھیرائی ہوئی حدوں سے آگے بڑھیں گے، اُنھیں وہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اُن کے لیے رسوا کر دینے والی سزا ہے۔''

۶۔ النساء ۴: ۴۸۔ 'اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَمَنۡ یُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدِ افۡتَرٰۤی اِثۡمًا عَظِیۡمًا'، ''اللہ اِس بات کو نہیں بخشے گا کہ (جانتے بوجھتے کسی کو) اُس کا شریک ٹھیرایا جائے۔ اِس کے نیچے، البتہ جس کے لیے جو گناہ چاہے گا، (اپنے قانون کے مطابق) بخش دے گا، اور (اِس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ) جو اللہ کا شریک ٹھیراتا ہے، وہ ایک بہت بڑے گناہ کا افترا کرتا ہے۔''

۷۔ النساء ۴: ۹۳۔ 'وَمَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیۡمًا'، ''اُس شخص کی سزا، البتہ جہنم ہے جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے، وہ اُس میں ہمیشہ رہے گا، اُس پر اللہ کا غضب اور اُس کی لعنت ہے اور اُس کے لیے اُس نے ایک بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

محمد وسیم اختر مفتی

مہاجرین حبشہ

(۱۳)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت سہلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا

والدین اور بہن بھائی

حضرت سہلہ مکہ میں پیدا ہوئیں۔ عرب کے مشہور سردار سہیل بن عمرو ان کے والد تھے۔ عبد شمس بن عبد ود ان کے پردادا اور عامر بن لؤی آٹھویں جد تھے، قریش کی شاخ بنو عامر بن لؤی انھی کے نام سے منسوب ہے۔ نویں جد لؤی بن غالب پر حضرت سہلہ بنت سہیل کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرے سے جا ملتا ہے۔ عامر بن لؤی کے بھائی کعب بن لؤی آپ کے آٹھویں جد تھے۔

حضرت سہلہ بنت سہیل کی والدہ فاطمہ بنت عبد العزیٰ بھی بنو عامر بن لؤی سے تھیں۔ حضرت عبد اللہ بن سہیل، حضرت ابو جندل بن سہیل اور حضرت عتبہ بن سہیل ان کے بھائی تھے۔

حضرت سہلہ کی ایک بہن ہند بنت سہیل کا بیاہ حضرت عبد الرحمٰن بن عتاب سے ہوا تھا (جمہرۃ انساب العرب ۱۶۶)، جب کہ دوسری بہن حضرت ام کلثوم بنت سہیل اپنے ماموں زاد حضرت ابو سبرہ بن ابو رہم کے نکاح میں تھیں۔

زمانۂ جاہلیت میں سہیل بن عمرو کا شمار قریش کے بڑے اور دانش مند سرداروں میں ہوتا تھا۔ عتبہ بن ربیعہ، ابوالبختری، نضر بن حارث، ابوجہل، امیہ بن خلف، سہیل بن عمرو اور دیگر سردار حاجیوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔ خطاب کا ملکہ رکھنے کی وجہ سے سہیل کو خطیب قریش کہا جاتا تھا۔ بعثت نبوی کے بعد سہیل دین حق کی مخالفت اور دشمنی میں سرگرم ہوگئے، اسلام کی مخالفت میں اپنی خطابت کے جوہر دکھانے میں پیش پیش رہے۔

بیعت ایمان

حضرت سہلہ اسلام کے ابتدائی دور میں اسلام لائیں اور نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔

پہلا نکاح

حضرت سہلہ بنت سہیل کا پہلا بیاہ حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ سے ہوا تھا جو 'السّٰبقون الأولون' میں سے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں منتقل ہونے سے پہلے ایمان لا چکے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حبشہ کی طرف ہجرت

رجب ۵/ نبوی (۶۱۵ء): دین حق کی طرف لپکنے والے مخلصین پر مشرکین مکہ کی ایذا رسانیاں حد سے بڑھ گئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا: تم حبشہ کی سرزمین کو نکل جاؤ، وہاں ایسا بادشاہ حکمران ہے جس کی سلطنت میں ظلم نہیں کیا جاتا۔ وہ امن اور سچائی کی سرزمین ہے، (وہاں اس وقت تک قیام کرنا) جب تک اللہ تمھاری سختیوں سے چھٹکارے کی راہ نہیں نکال دیتا۔ چنانچہ سب سے پہلے سولہ اہل ایمان نصف دینار فی مسافر کرائے پر کشتی لے کر حبشہ روانہ ہوئے۔ قریش نے ان کا پیچھا کیا، لیکن وہ سمندر میں اپنا سفر شروع کر چکے تھے۔ بارہ (گیارہ: ابن سعد) مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل اس قافلے میں حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ اور ان کی اہلیہ حضرت سہلہ بنت سہیل شامل تھے۔ دیگر شرکا یہ تھے: حضرت عثمان بن عفان، ان کی اہلیہ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ، حضرت زبیر بن عوام، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عامر بن ربیعہ، ان کی زوجہ حضرت لیلیٰ بنت ابوحثمہ، حضرت ابوسبرہ بن ابورہم، حضرت سہیل بن بیضا، حضرت حاطب بن عمرو، حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد، ان کی اہلیہ حضرت ام سلمہ بنت ابوامیہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود۔ اسے ہجرت اولیٰ کہا جاتا ہے۔ دو ماہ کے بعد دو کشتیوں پر سوار سڑسٹھ اہل ایمان کا دوسرا گروپ نکلا، جس کی قیادت حضرت جعفر بن ابوطالب نے کی۔

محمد بن ابو حذیفہ کی پیدایش حبشہ میں ہوئی۔

مکہ کی طرف رجوع

شوال ۵/ نبوی میں قریش کے قبول اسلام کی افواہ حبشہ میں موجود مسلمانوں تک پہنچی تو ان میں سے کچھ یہ کہہ کر مکہ کی طرف روانہ ہو گئے کہ ہمارے کنبے ہی ہمیں زیادہ محبوب ہیں۔ مکہ پہنچنے سے پہلے ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ اطلاع غلط تھی تو وہ پھر حبشہ لوٹ گئے۔ اسے ہجرت ثانیہ کہا جاتا ہے۔ تاہم حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ، ان کی اہلیہ حضرت سہلہ بنت سہیل، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عبد اللہ بن جحش، حضرت ابو سلمہ اور ان کی اہلیہ حضرت ام سلمہ ان تینتیس اصحاب اور آٹھ صحابیات میں شامل تھے جو مکہ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے دو کا مکہ میں انتقال ہو گیا، سات کو مشرکوں نے قیدی بنا لیا اور چوبیس نے مدینہ ہجرت کر کے جنگ بدر میں حصہ لیا۔ حضرت سہلہ اور حضرت ابو حذیفہ کا شمار ان چوبیس میں تھا۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہجرت مکرر، سوے مدینہ

۱۰/ نبوی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر یثرب سے حج کے لیے آئے ہوئے خزرج کے چھ افراد مشرف بہ اسلام ہوئے، اگلے برس بارہ اور ۱۲/ نبوی میں بہتر (۷۲) لوگوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ نصرت اسلام کی ان بیعتوں کے بعد آپ نے صحابہ کو مدینہ کی طرف ہجرت کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا: اللہ نے تمھارے بھائی بند بنا دیے ہیں اور ایسا شہر دے دیا ہے جہاں تم اطمینان سے رہ سکتے ہو۔ چنانچہ حضرت سہلہ اور ان کے شوہر حضرت ابو حذیفہ نے آپ کے ارشاد پر پھر اپنا گھر بار اور مال و دولت چھوڑ کر مدینہ کو ہجرت مکرر کی۔ سب سے پہلے حضرت ابو سلمہ مدینہ پہنچے، ان کے بعد حضرت عامر بن ربیعہ، حضرت عبد اللہ بن جحش اور ان کے بھائی حضرت ابو احمد عبد نے دار ہجرت کا رخ کیا۔ دو ماہ کے بعد اکثر اہل ایمان نے ہجرت کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ حضرت سہلہ بنت سہیل اور حضرت ابو حذیفہ حضرت عمر کے بیس افراد پر مشتمل قافلۂ ہجرت میں شامل ہوئے۔ حضرت زید بن خطاب، حضرت خنیس بن حذافہ، حضرت سعید بن زید، حضرت عبد اللہ بن سراقہ، حضرت عمرو بن سراقہ، حضرت واقد بن عبد اللہ، حضرت خولی بن ابو خولی، حضرت مالک بن ابو خولی، حضرت ایاس بن بکیر، حضرت عاقل بن بکیر، حضرت عامر بن بکیر اور حضرت خالد بن بکیر ان کے شریک سفر تھے۔

حضرت سہلہ اور حضرت ابو حذیفہ قبیلۂ بنو عبد الاشہل میں حضرت عباد بن بشر کے مہمان ہوئے۔ آں حضرت

صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲/ ربیع الاول کو تشریف لائے۔ آپ نے مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات قائم فرمائی تو حضرت ابو حذیفہ کے میزبان حضرت عباد بن بشر ہی کو ان کا انصاری بھائی قرار دیا۔

جنگ بدر

حضرت سہلہ کے شوہر حضرت ابو حذیفہ نے جنگ بدر میں بھرپور شرکت کی۔ ان کا والد عتبہ بن ربیعہ کفار کی طرف سے لڑتا ہوا جہنم واصل ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا: تمھیں اپنے باپ کے انجام سے دکھ پہنچا ہے؟ تو جواب دیا: میرا باپ مشرک تھا اور اس کا یہی انجام ہونا تھا۔ البتہ یہ رنج ضرور ہے کہ اس کی دانش اور معاملہ فہمی اس کے کام نہ آئی۔

حضرت سہلہ کے بھائی حضرت عبد اللہ بن سہیل ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے جنھوں نے حبشہ کو ہجرت کی۔ قریش کے قبول اسلام کی افواہ سن کر مکہ لوٹے تو والد سہیل بن عمرو نے مشکیں کس کر قید کر دیا اور جنگ بدر میں مشرکوں کے لشکر میں گھسیٹ لیا۔ اہل ایمان اور اہل شرک کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو کفار کی فوج سے بھاگ نکلے اور جیش اسلامی میں شامل ہو کر اپنے والد کے جتھے کا مقابلہ کیا۔

غزوۂ بدر میں حضرت مالک بن دخشم انصاری نے سہیل بن عمرو کو قید کر لیا، لیکن اسے مدینہ لے جایا جا رہا تھا کہ وہ بھاگ نکلا۔ حضرت مالک نے اہل ایمان کو مدد کے لیے پکارا تو سب سہیل کے پیچھے دوڑ پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا: جو اسے پکڑے، قتل کر دے۔ سہیل جھاڑیوں میں چھپا ملا، اس کے ہاتھ گردن سے باندھ کر مدینہ لایا گیا۔ حضرت سہلہ نے اس موقع پر صبر وسکون کا مظاہرہ کیا اور جنگ بدر میں فتح پانے کی خوشیوں میں شریک رہیں۔

دودھ پلائی کا قصہ

حضرت سالم کے والد کا نام معقل تھا، حضرت ثبیتہ بنت یعار انصاریہ کے غلام تھے، انھوں نے آزاد کر دیا تو حضرت ابو حذیفہ نے انھیں متبنیٰ بنا لیا اور اپنی بھانجی حضرت ہند بنت ولید سے ان کا بیاہ کر دیا (بخاری، رقم ۵۰۸۸)۔ جنگ بدر کے بعد لے پالکوں کے بارے میں اللہ کا حکم 'اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآىِٕهِمۡ'، ''لے پالکوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارو'' (الاحزاب ۳۳: ۵) نازل ہوا تو انھیں سالم مولیٰ ابو حذیفہ کہا جانے لگا۔ تبھی حضرت سہلہ بنت سہیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا: ہمارا متبنیٰ سالم عاقل و بالغ ہو گیا ہے،

وہ میرے اور ابو حذیفہ کے ساتھ ایک ہی مکان (تنگ مکان: احمد، رقم ۲۵۹۱۳) میں رہتا ہے۔ میرے پاس (بے تکلف) آتا جاتا ہے، اور مجھے کام کاج کے مختصر کپڑوں میں دیکھتا رہتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ابو حذیفہ اس بات کو برا سمجھتے ہیں۔ اللہ نے ایسے ملازمین کے بارے میں جو حکم نازل کر رکھا ہے اس کی روشنی میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اسے دودھ پلا دو، وہ تمھارے لیے محرم بن جائے گا اور ابو حذیفہ کی خفگی جاتی رہے گی۔ حضرت سہلہ نے کہا: میں اسے کیسے دودھ پلاؤں، وہ تو (ڈاڑھی مونچھ والا) بڑا آدمی ہے؟ آپ مسکرائے اور فرمایا: میں جانتا ہوں کہ وہ (بچہ نہیں) بڑا ہے۔ چنانچہ حضرت سہلہ نے اسے پانچ بار دودھ چسایا اور وہ ان کے رضاعی بیٹے کے مانند ہو گیا (مسلم، رقم ۳۵۹۱۔ ابو داؤد، رقم ۲۰۶۱۔ نسائی، رقم ۳۳۲۵۔ ابن ماجہ، رقم ۱۹۴۳۔ احمد، رقم ۲۴۱۰۸، ۲۵۶۵۰۔ موطا امام مالک، رقم ۱۸۸۴۔ مستدرک حاکم، رقم ۲۶۲۹۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۲۰۱۹۹)۔ ایک روایت کے مطابق کسی ڈبیا یا برتن میں پانچ دن تک دودھ نکالا جاتا رہا اور سالم اسے پیتے رہے (الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۱۹۹/۶)۔ دودھ پلائی کے بعد حضرت سہلہ بنت سہیل پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو نبی بنا کر مبعوث کیا ہے! میں اب ابو حذیفہ کے چہرے پر ناگوار تاثرات نہیں دیکھتی (نسائی، رقم ۳۲۲۳)۔

حضرت عائشہ نے اپنی بہن ام کلثوم بنت ابو بکر، بھتیجیوں، بھانجیوں، حتیٰ کہ حضرت ام سلمہ کو بھی گھر میں آنے جانے والے ملازموں کے باب میں اسی طریقے پر عمل کرنے کا مشورہ دیا (احمد، رقم ۲۵۴۱۵)۔ اس باب میں انھوں نے پانچ دفعہ دودھ پلانے کی شرط لگائی اور کہا: ایک بار یا دو بار دودھ چسانا حرمت رضاعت ثابت نہیں کرتا (مسلم، رقم ۳۵۸۰۔ ابو داؤد، رقم ۲۰۶۲۔ ۲۰۶۳۔ ترمذی، رقم ۱۱۵۰۔ نسائی، رقم ۳۳۱۲۔ احمد، رقم ۲۴۰۲۶)۔ ایک روایت میں دس بار کا حکم ہے (احمد، رقم ۲۶۳۱۵)، لیکن حضرت عائشہ کہتی ہیں: یہ حکم منسوخ ہو گیا ہے اور پانچ بار کی شرط ضروری ہے (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۵۶۱۹۔ موطا امام مالک، رقم ۱۸۹۰۔ الام، شافعی، رقم ۴۴/۵)۔ سیدہ ام سلمہ اور باقی ازواج النبی نے پسند نہ کیا کہ گود میں بٹھائے بغیر اس طرح کی دودھ پلائی کے ذریعے سے وہ کسی شخص کو اپنے گھر میں داخل کر لیں۔ وہ حضرت عائشہ سے کہتی تھیں کہ شاید یہ ایک رخصت ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض سالم کے لیے جائز قرار دی ہو (مسلم، رقم ۳۵۹۵۔ ابو داؤد، رقم ۲۰۶۱۔ نسائی، رقم ۳۳۲۷۔ ابن ماجہ، رقم ۱۹۴۷۔ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۳۸۸۶)۔ حضرت ام سلمہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ بچے کی عمر دو سال سے زیادہ ہو جائے تو حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی (ترمذی، رقم ۲۵۱۱۔ موطا امام مالک، رقم ۱۸۸۶)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فقہا کے خیال میں حضرت ام سلمہ کا اجتہاد درست تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت سہلہ کو دی ہوئی اجازت کو انھی سے مخصوص ماننا اسے منسوخ کہنے سے بہتر ہے۔ رضاعت کے لیے دو سال تک کی عمر معتبر ہے اور یہ ضروری ہے کہ دودھ پلائی سے بچے کی نشو و نما ہو اور دودھ اس کا جزو بدن بنے۔

صلح حدیبیہ

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت سہلہ کے بھائی حضرت ابو جندل بیڑیوں میں جکڑے، گھسٹتے ہوئے آئے اور مسلمانوں کے آگے گر گئے۔ سہیل نے اپنے بیٹے کو تھپڑ مارا اور کہا: یا محمد، یہ پہلا فرد ہے جسے لوٹانے کی شرط میں نے منوائی ہے۔ پھر انھیں گریبان سے کھینچتے ہوئے واپس بھیج دیا۔ وہ پکارتے رہے: مسلمانو، کیا مشرک مجھے ایذائیں پہنچا کر اپنا دین چھوڑنے پر مجبور کرتے رہیں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابو جندل، صبر کرو، اللہ تعالیٰ تم کم زوروں کے نکلنے کی راہیں کھول دے گا۔ ہم نے قریش سے جو معاہدہ کیا ہے، اس کی خلاف ورزی نہ کریں گے۔

مرض استحاضہ

حضرت سہلہ بنت سہیل کو استحاضہ کا مرض لاحق ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ہر نماز کے لیے غسل کرنے کا حکم دیا۔ ایسا کرنا ان کے لیے دشوار ہو گیا تو آپ نے سہولت دے کر فرمایا: ایک غسل کر کے ظہر و عصر اکٹھی پڑھ لو، اسی طرح مغرب و عشا کو ایک غسل کے ساتھ ادا کر لو اور فجر کے لیے علیحدہ غسل کر لو (ابوداؤد، رقم ۲۹۵)۔

حضرت ابو حذیفہ کی شہادت

۱۱ھ میں خلیفۂ اول حضرت ابو بکر نے یمامہ کے جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے تیرہ ہزار کا لشکر حضرت خالد بن ولید کی سربراہی میں روانہ کیا۔ حضرت ثابت بن قیس اور حضرت براء بن فلان انصار کے کمانڈر تھے، جب کہ حضرت ابو حذیفہ اور حضرت زید مہاجرین کے سالار تھے۔ حضرت ابو حذیفہ نے آخری دم تک دشمن سے مقابلہ کرنے کا عہد کیا۔ پھر پکارے: اے قرآن کے حاملو، قرآن کو اپنے کارناموں سے مزین کرو۔ مسیلمہ کے لشکر کی صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور جام شہادت نوش کیا۔ حضرت ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام حضرت سالم اور ان کے انصاری بھائی حضرت عباد بن بشر بھی اسی معرکہ میں شہید ہوئے۔

اولاد: حضرت ابو حذیفہ سے اور ان کے بعد

حضرت ابو حذیفہ سے حضرت سہلہ کے ہاں محمد پیدا ہوا جو اپنے چچا حضرت عثمان کی کفالت میں رہا۔ عہد عثمانی میں اس نے شراب پی تو حضرت عثمان نے اس پر حد جاری کر دی۔ اس نے گورنری کا مطالبہ کیا تو انھوں نے کہا، تو اہل ہوتا تو تجھے ضرور گورنر بناتا۔ عہدہ نہ ملنے کے رنج میں وہ مصر چلا گیا اور اہل مصر کو حضرت عثمان کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا اور بلوے کے موقع پر ان پر آگے بڑھ کر حملہ کیا۔

جنگ یمامہ میں حضرت ابو حذیفہ کی شہادت کے بعد حضرت سہلہ بنو مالک بن حسل کے عبد اللہ بن اسود کے نکاح میں آئیں جن سے سلیط بن عبد اللہ پیدا ہوئے، پھر بنو سلیم بن منصور کے شماخ بن سعید کے عقد میں رہیں جن سے بکیر (یا عامر) بن شماخ نے جنم لیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ بہت کھوج کے باوجود ان دونوں کے حالات زندگی ہمیں کہیں نہ مل سکے۔ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ صحابہ میں سے نہ تھے۔ یہ ترتیب ازدواج ابن سعد کی بیان کردہ تھی، ابن حجر کے کہنے کے مطابق شماخ بن سعید دوسرے اور عبد اللہ بن اسود تیسرے نمبر پر تھے۔ آخر میں حضرت سہلہ بنت سہیل نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے ساتھ گھر بسایا۔ تب سالم کی ولادت ہوئی۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف پہلے آٹھ مسلمانوں میں شامل تھے اور ان پانچ اصحاب میں سے ایک تھے جو حضرت ابو بکر کی دعوت پر ایمان لائے، عشرۂ مبشرہ میں سے تھے۔

روایت حدیث

حضرت سہلہ بنت سہیل سے مروی دودھ پلائی کی ایک ہی روایت ہے جو ان سے قاسم بن محمد نے اور ان سے عبید اللہ بن ابو ملیکہ نے نقل کی۔ ابن ابو ملیکہ کہتے ہیں: میں نے خوف کے مارے ایک سال تک یہ روایت کسی سے بیان نہیں کی، پھر قاسم سے میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا: اسے میرا اور عائشہ کا نام لے کر بیان کر دو (مسلم، رقم ۳۵۹۲۔ احمد، رقم ۲۵۶۴۹۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۶۳۷۳۔ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۳۸۸۴)۔

مطالعۂ مزید: الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبد البر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت یزید بن زمعہ رضی اللہ عنہ

سلسلۂ نسب

حضرت یزید بن زمعہ زمانۂ جاہلیت میں قریش کے معتبر سردار تھے۔ مکہ کے قبیلہ بنو اسد میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا کا نام اسود بن مطلب تھا۔ ان کا قبیلہ ان کے سکڑ دادا اسد بن عبد العزیٰ کے نام سے موسوم ہے۔ قصی بن کلاب پر ان کا سلسلۂ نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرے سے جا ملتا ہے۔ قصی ان کے چھٹے، جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچویں جد تھے۔ حضرت یزید کی والدہ قریبہ بنت ابوامیہ بنو مخزوم سے تھیں۔ حضرت ام سلمہ ان کی خالہ تھیں۔ حضرت عبد اللہ بن زمعہ، حضرت وہب بن زمعہ اور مشرک حارث بن زمعہ ان کے سگے بھائی تھے۔ حضرت یزید کا دادا اسود ام المومنین حضرت خدیجہ کا چچا زاد تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نانی برہ بنت عبد العزیٰ اس کی پھوپھی تھیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

زمانۂ جاہلیت میں

دور جاہلیت میں قریش کے دس گوتوں (بطون) کے دس افراد تھے جنھیں ان کی معاشی و معاشرتی زندگی میں اہم مقام حاصل تھا۔ بنو ہاشم کے عباس بن عبد المطلب حاجیوں کو پانی پلاتے، بنو امیہ کے ابو سفیان بن حرب کے پاس قریش کا علم عقاب تھا، بنو نوفل کے حارث بن عامر حجاج کی مالی ضروریات پوری کرتے، بنو عبد الدار کے عثمان بن طلحہ جنگوں میں پرچم برداری کرتے اور خانہ کعبہ کی دیکھ بھال کرتے، کعبہ کے دروازے کی کنجی انھی کے پاس تھی۔ بنو اسد کے یزید بن زمعہ سے مشاورت کی جاتی، کیونکہ انھیں دانش منداور ذوالرائے سمجھا جاتا تھا، قریش ان کی تصدیق کے بغیر کوئی اہم فیصلہ نہ کرتے۔ اگر انھیں اتفاق ہوتا تو اسی پر عمل کرنے کو کہتے، دوسری صورت میں وہ خود فیصلہ کرتے اور سب ان کا بھرپور ساتھ دیتے۔ بنو تیم کے ابو بکر صدیق دیت اور تاوان کے معاملات طے کرتے۔ بنو مخزوم کے خالد بن ولید کسی معرکے پر جانے سے پہلے ایک خیمہ لگوا کر اس میں سامان حرب جمع کرتے اور گھڑ سواروں (cavalry) کی کمان کرتے۔ بنو عدی کے عمر بن خطاب جنگوں میں سفارت کا فریضہ انجام دیتے۔ بنو جمح کے صفوان بن امیہ تیروں کے ذریعے سے فال نکالتے اور ان کی فال کے مطابق عمل کیا جاتا۔ بنو سہم کے حارث بن قیس کو نزاعات میں فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ بتوں پر چڑھنے والے چڑھاوے ان کے پاس جمع ہوتے۔ ان کی بیوی غیطلہ بنت مالک مکہ کی مشہور کاہنہ تھی (العقد الفرید،

ابن عبدربہ ۳/ ۲۶۷-۲۶۸۔ بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب، محمود شکری ۲۴۹-۲۵۰)۔

آمد اسلام کے بعد

وادی بطحا میں نور اسلام کی کرنیں پھیلنا شروع ہوئیں تو حضرت یزید بن زمعہ بھی نور ایمان سے منور ہوئے۔ اگرچہ انھیں 'السّٰبقون الأولون' میں شمار نہیں کیا گیا، تاہم وہ فجر اسلام میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔

باپ دادا کی عداوت اور انصاف پسندی

حضرت زمعہ کا دادا اسود بن مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا تو آنکھیں مٹکاتا، ٹھٹھا کرتے ہوئے کہتا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، آج آسمان سے گفتگو نہیں کی۔ صحابہ سے مخاطب ہوتا: یہ عالم پناہ ہیں جو قیصر و کسریٰ کا تخت سنبھالیں گے۔ آپ بیت اللہ کا طواف کرنے آتے تو وہ دوسرے مشرک سرداروں عاص بن وائل، ولید بن مغیرہ اور عبد یغوث بن وہب کے ساتھ مل کر آپ کا استہزا کرتا۔ آنکھوں سے تمسخر کرنے کی پاداش میں اللہ نے اسے اندھا کر دیا۔ حضرت یزید کا بھائی حارث بن زمعہ ایمان لایا تو والد زمعہ نے اسے قید کر کے تشدد کا نشانہ بنایا۔ چنانچہ وہ دوبارہ کافر ہو گیا۔ حضرت یزید کے والد زمعہ بن اسود اور دادا اسود بن مطلب نے اسلام قبول کرنے کے بجاے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دین حق کی دعوت سے روکنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ اس کا کہنا تھا، ہم مل کر ایک دوسرے کے الٰہ کو پوج لیتے ہیں، تب سورۂ کافرون نازل ہوئی۔

حضرت یزید کے دادا اسود کے استہزا کے باوجود جب قریش نے بنو ہاشم کا مقاطعہ کر کے انھیں شعب ابو طالب میں محصور ہونے پر مجبور کیا تو ان کے والد ابو حکیمہ زمعہ بن اسود نے ابوالبختری بن ہشام، ہشام بن عمرو، زہیر بن ابوامیہ اور مطعم بن عدی کے ساتھ مل کر رؤساے قریش کا کیا ہوا بائیکاٹ کا معاہدہ ختم کرانے کی کوشش کی۔ اس پر ابو طالب نے شکریہ کے چند اشعار کہے (نسب قریش، مصعب زبیری ۴۳۱)، ان میں سے پہلا یہ ہے:

جزی اللہ رھطاً من لؤی تتابعوا　　　علی ملاء یھدی لحزم و یرشد

"اللہ لؤی بن غالب کی اولاد کو جزا دے جو ان اشراف کے قدم بہ قدم چلی جنھیں دور اندیشی اور راہ صواب پر چلنے کی ہدایت دی گئی تھی۔"

ہجرت حبشہ

گھر کے ان حالات میں حضرت یزید بن زمعہ کی گزر بسر مشکل ہو گئی۔ اس لیے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشاد پر دیگر مہاجرین کے ہم راہ حبشہ کو روانہ ہو گئے۔ یہ ہجرت ثانیہ تھی۔

حبشہ سے مدینہ کو ہجرت

حضرت یزید بن زمعہ جنگ بدر کے بعد، ۷ھ میں حضرت جعفر بن ابو طالب کے قافلے کی واپسی سے پہلے یا بعد کسی وقت مدینہ پہنچے۔ ابن اسحاق نے عازمین حبشہ اور وہاں سے لوٹنے والوں کی فہرست میں حضرت یزید بن زمعہ کا نام شامل نہیں کیا۔

غزوات میں شرکت

غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت یزید بن زمعہ حبشہ سے مدینہ منورہ نہیں پہنچے تھے۔ البتہ ان کا باپ زمعہ بن اسود، چچا عقیل بن اسود اور ایک بھائی حارث بن زمعہ مشرک فوج کی طرف سے لڑتے ہوئے انجام کو پہنچے۔ دادا اسود نابینا ہونے کی وجہ سے نہ آ سکا تھا۔ زمعہ کو حضرت ثابت بن جذع، حضرت حمزہ اور حضرت علی نے اور حارث کو حضرت عمار بن یاسر نے جہنم رسید کیا (السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام ۲/ ۲۶۷)۔ احد اور خندق کی جنگوں میں حضرت یزید بن زمعہ کی شمولیت کا ذکر نہیں ملتا۔ غزوۂ فتح میں ان کی شرکت کا اشارہ ملتا ہے، کیونکہ وہ فتح مکہ پر موجود تھے تبھی تو وہاں سے حنین جانے والی فوج میں شامل ہوئے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

غزوۂ حنین، حضرت یزید کی شہادت

۲۰/ رمضان ۸ھ (۶۳۰ء): میں مکہ فتح ہوا، مکہ اور طائف کے درمیان واقع وادی حنین میں آباد بنو ہوازن اور بنو ثقیف کو یہ خبر سن کر اندیشہ ہوا کہ اب ہمیں زیر کیا جائے گا۔ اس لیے پیش بندی کے طور پر حملہ میں پہل کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ ہوازن کا رئیس مالک بن عوف ان کی قیادت کر رہا تھا۔ اطلاع ملنے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم بارہ ہزار کا عظیم الشان لشکر لے کر مقابلے کے لیے نکلے۔ اپنی کثرت دیکھ کر بے اختیار بعض صحابہ کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے: بھلا آج ہم پر کون غالب آ سکتا ہے۔ لیکن ۱۰/ شوال کو علی الصبح جب وہ وادی حنین کی اترائی میں اترے تو گھات لگائے ہوئے دشمن کی کمین گاہوں سے زبردست تیر اندازی شروع ہو گئی اور ہزاروں کی تعداد میں کفار تلواریں لے کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ وہ دو ہزار نو مسلم جو لشکر اسلام میں شامل ہو کر مکہ سے آئے تھے ایک دم سر پر پیر رکھ کر بھاگ نکلے۔ انھیں دیکھ کر انصار و مہاجرین بھی پریشان ہو گئے۔ چند جاں نثار صحابہ میدان میں رہ گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادی کے دائیں جانب ہٹ کر ٹھیر گئے اور دونوں طرف

رخ کر کے بلند آواز میں پکارے: اللہ کے انصار، میرے پاس آؤ، میں رسول اللہ، محمد بن عبداللہ یہاں موجود ہوں۔ آپ کے حکم پر حضرت عباس بھی مہاجرین و انصار کو پکارتے رہے۔ بھاگتے ہوئے مسلمانوں کے لیے اپنی سواری پلٹانا بھی مشکل تھا، اکثر نے زرہ اتاری اور تلوار اور ڈھال پکڑ کر کود پڑے۔ کچھ ہی دیر میں صحابہ آپ کے پاس جمع ہو کر بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کرنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفید خچر دلدل پر سوار، یہ رجز پڑھ رہے تھے (بخاری، رقم ۲۸۷۴)۔

اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

''میں نبی ہوں، اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''

حضرت علی نے ہوازن کے سپہ سالار مالک بن عوف کے اونٹ کے گھٹنوں پر تلوار کا وار کیا اور ایک انصاری نے آگے بڑھ کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ چشم زدن میں جنگ کا پانسا پلٹ گیا۔ کفار مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور بھاگ نکلے، کچھ قتل ہو گئے، جو رہ گئے گرفتار ہو گئے۔ قبیلۂ ثقیف کی فوجیں آخری دم تک لڑتی رہیں، یہاں تک کہ ان کے ستر بہادر کٹ گئے۔ لیکن جب ان کا علم بردار عثمان بن عبداللہ قتل ہو گیا تو ان کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔ فتح مبین نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کا بوسہ لیا اور کثیر تعداد میں مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس غزوہ میں حضرت یزید بن زمعہ، حضرت آمنہ کی وفات کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کرنے والی حضرت ام ایمن کے بیٹے حضرت ایمن بن عبید، حضرت سراقہ بن حارث (حباب: ابن حجر) انصاری اور حضرت ابوعامر اشعری نے جام شہادت نوش کیا (السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام ۴/ ۷۹۔ تاریخ الامم والملوک، طبری ۲/ ۱۷۱۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ابن عبدالبر ۴/ ۱۵۷۵۔ الکامل فی التاریخ، ابن اثیر ۲/ ۷/ ۱۳۱۔ البدایۃ والنہایۃ ۴/ ۶۰۵)۔ ابن عبدالبر، ابن اثیر اور ابن حجر نے حضرت ابوعامر اشعری کو جنگ حنین کے فوراً بعد ہونے والی جنگ اوطاس کا شہید بتایا ہے۔ قرآن مجید میں غزوۂ حنین کا ذکر ان آیات میں آیا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ. ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے بہت سے میدانوں میں تمھیں فتح دی ہے اور حنین کی لڑائی والے دن بھی جب تمھیں اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا، لیکن اس فخر نے تمھیں کوئی فائدہ نہ دیا، بلکہ زمین باوجود اپنی کشادگی کے تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر

رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ.(التوبہ ۹: ۲۵-۲۶)

بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی تسکین اتاری اور وہ لشکر بھیجے جو تم نے نہیں دیکھے اور کافروں کو پوری سزا دی۔ ان کفار کا یہی بدلہ تھا۔“

ابن سعد کا اختلاف

ابن سعد کہتے ہیں کہ حضرت یزید بن زمعہ حصار طائف میں شہید ہوئے۔ ان کا جناح نامی گھوڑا بے قابو ہو کر انھیں طائف کے قلعے تک لے گیا۔ کفار کے نرغے میں آنے کے بعد انھوں نے بات چیت کرنے کے لیے امان مانگی۔ انھیں امان تو مل گئی، لیکن ان کی بات سننے کے بعد ان پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ یوں وہ مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے (الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۳/ ۸۵)۔ کتب تاریخ میں حصار طائف میں شہادت حاصل کرنے والے اصحاب کا کل شمار بارہ بتایا گیا ہے۔ ان میں سات کا تعلق قریش سے، چار کا انصار سے اور ایک کا بنولیث سے تھا۔ حضرت یزید بن ابوزمعہ کا نام کسی نے بیان نہیں کیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اولاد

حضرت یزید بن زمعہ کی اولاد نہ ہوئی۔

روایت حدیث

حضرت یزید بن ابوزمعہ عہد رسالت میں وفات پا گئے، اس لیے کسی راوی حدیث کو ان سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم و الملوک (طبری)، انساب الاشراف (بلاذری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبد البر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

ڈاکٹر ریحان احمد یوسفی

اللہ اور رسول کی محبت

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ روز ازل ابلیس نے اللہ تعالیٰ کو یہ چیلنج دیا تھا کہ وہ خدا کی بندگی اور اطاعت کی سیدھی راہ سے لوگوں کو بھٹکانے کے لیے اس راہ میں بیٹھ جائے گا اور ہر جگہ سے انسانوں کو گم راہ کرنے کی کوشش کرے گا (الاعراف ۷: ۱۶)۔

ابلیس اور اس کی اولاد نے ہر دور میں اپنے اس مشن کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس راہ میں انھوں نے ہمیشہ برائی ہی کا راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ ان چیزوں کو بھی استعمال کیا جو اچھی اور مذہبی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک اہم چیز محبت ہے۔ نصاریٰ کے متعلق معلوم ہے کہ انھوں نے اسی مثبت جذبے میں غلو کرکے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنا دیا تھا۔

یہی پس منظر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے محبت کے معاملے میں لوگوں کی براہ راست رہنمائی کرکے کچھ چیزیں اصول کے طور پر بیان کر دی ہیں۔ ان چیزوں کو ملحوظ رکھا جائے گا تو محبت کا جذبہ انسان کے دین کو وہ حسن و جمال عطا کرے گا جو نیکیوں میں سبقت اور آخرت میں رب کی قربت کا سبب بنے گا۔

ان میں سے پہلی چیز محبت کا ایمان سے یہ تعلق واضح کرنا ہے کہ محبت ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ کوئی شخص اگر سوچ سمجھ کر ایمان لایا ہے تو اس کا ایمان اللہ کو اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب بنا دے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"جو لوگ ایمان لائے، وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔" (البقرہ ۲: ۱۶۵)

ایمان کے ساتھ محبت کے تعلق کی یہی وہ نوعیت ہے جس کی بنا پر پورا قرآن ایمان کے مطالبے سے بھرا ہوا

ہے، لیکن ایک مقام پر بھی قرآن مجید نے محبت کو کسی دینی مطالبے کے طور پر پیش نہیں کیا۔ یہی معاملہ روایات کا بھی ہے کہ وہاں اسے کسی مستقل دینی مطالبے کے بجاے ایمان سے متعلق کر کے بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ تین چیزیں جس شخص میں ہوں گی، وہ ان کے سبب سے ایمان کا مزہ چکھے گا۔ ان میں سے تیسری یہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول دوسری تمام چیزوں سے زیادہ انسان کو محبوب ہو جائے (بخاری، رقم ۱۶۔ مسلم، رقم ۴۳)۔

یہی چیز دیگر روایات میں بھی بیان ہوئی ہے اور عین قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ دین کا اصل مطالبہ ایمان خالص ہے۔ جب یہ پیدا ہو گا تو اللہ کی محبت اور تبعاً اُس کے رسول کی محبت بھی خود بخود پیدا ہو گی۔ عقل عام بھی اس بات کی تائید کرتی ہے۔ ہمیں اپنے ماں باپ سے محبت اُس تعلق کی بنیاد پر ہوتی ہے جو اولاد اور والدین کے درمیان ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمارے وجود کا ماخذ اور قربانیاں دے کر ہمیں بچپن کی عمر سے بڑا کر کے پختگی کی عمر تک پہنچانے والے ہیں۔

ایمان ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ اللہ ہے جس نے ہمیں وجود دیا اور ہر طرح کی نعمتیں دی ہیں۔ یہ علم خدا کو ہمارا محبوب بنا دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہمارا ایمان یہ بتاتا ہے کہ آپ ہی کی ہستی ہے جنھوں نے ہمیں اپنے خدا کی صفات، اس کی بندگی اور رضا حاصل کرنے کے طریقوں سے آگاہ کیا ہے۔ جس طرح والدین ہمارے جسمانی وجود کا ماخذ ہیں، نبی ہمارے ایمانی وجود کا ماخذ ہیں۔ یہیں سے حضور کریم علیہ السلام کی محبت جنم لیتی ہے۔ چنانچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایمان ہے تو محبت لازمی ہو گی اور ایمان نہیں ہے تو محبت نہیں ہو گی۔ ہاں نفس و شیطان کا ایک دھوکا محبت کے نام پر البتہ ہو سکتا ہے اور اکثر ہوتا بھی وہی ہے۔

امتوں کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس و شیطان کے اس دھوکے کے تین دائرے ہوتے ہیں۔ پہلا وہ جس میں انسان اللہ کی محبت کے ساتھ غیر اللہ کی محبت کو جمع کر لیتا ہے اور سمجھتا یہ ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اللہ کی محبت میں کر رہا ہوں۔ اس پر قرآن نے اس طرح توجہ دلائی ہے:

> ”لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو اوروں کو اللہ کے برابر ٹھیراتے ہیں، وہ ان سے اسی طرح محبت کرتے ہیں، جس طرح اللہ سے کرتے ہیں۔“ (البقرہ ۲: ۱۶۵)

تمام مشرک اقوام اور اہل کتاب میں سے نصاریٰ نے یہ دھوکا کھایا۔ وہ خود بھی گم راہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گم راہ کیا۔

نفس و شیطان کے دھوکے کا دوسرا دائرہ وہ ہے جس کی نمایاں مثال یہودی ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ خدا ان کا محبوب اور وہ خدا کے محبوب ہیں۔ چنانچہ اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے دعویٰ محبت کی حقیقت کو جاننے کی ایک کسوٹی قرآن نے اس طرح بیان کر دی:

"ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا، اور اللہ بخشنے والا ہے، اس کی شفقت ابدی ہے۔" (آل عمران ۳: ۳۱)

یہود کے پس منظر میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اتباع کا بیان دو بڑی نمایاں حکمتیں رکھتا تھا۔ ایک اپنے گروہی تعصبات سے بلند ہو کر ایک ایسی ہستی کی پیروی جس کا تعلق دوسرے گروہ سے تھا۔ دوسرے اپنے خود ساختہ معیارات سے اوپر اٹھ کر خدا کے طے کردہ معیارات پر اپنی وفاداری ثابت کرنا۔ یہ دونوں چیزیں انتہائی مشکل ہیں اور سچے ایمان اور خدا سے غیر معمولی محبت کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتیں۔

چنانچہ محبت کے جھوٹے دعوے داروں کو نفس و شیطان اس طرح دھوکا دیتے ہیں کہ وہ در حقیقت اپنے گروہی اور فرقہ دارانہ تعصبات کا شکار ہوتے ہیں، مگر خود ساختہ معیارات کے مطابق چند مراسم ادا کرنے کو بندگی اور ایمان کی معراج سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ خدا کی محبت کا ثبوت دینا ہے تو اپنے گروہ سے اوپر اٹھ کر صرف خدا کے لیے جینا ہو گا اور اپنے خود ساختہ معیار کے بجاے خدا کے معیار کے مطابق، اُس کی بندگی اختیار کرنی ہو گی۔

نفس و شیطان کے دھوکے کا تیسرا دائرہ وہ ہے جس میں لوگ دعویٰ محبت کرتے ہیں، لیکن جہاں ان کے مفادات پر ضرب لگے، خواہشات کا راستہ رکے اور راہ وفا میں دیگر مشکلات پیش آئیں، لوگ عملاً کوئی نہ کوئی عذر پیش کر کے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جب ایمان کے دعوے داروں نے یہ رویہ اختیار کیا تو قرآن مجید میں اُن کو اس طرح تنبیہ کی گئی:

"ان سے کہہ دو اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارا خاندان اور تمھارا وہ مال جو تم نے کمایا ہے اور تمھاری وہ تجارت جس کے مندے ہو جانے سے تم ڈرتے ہو اور تمھارے وہ گھر جنھیں تم پسند کرتے ہو، یہ سب تمھیں اللہ سے، اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے۔" (التوبہ ۹: ۲۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایمان لانے والوں کو جو امتحان در پیش تھا، اس میں ایک طرف

انھیں خدا کی بندگی اور اطاعت رسول کے سارے تقاضے پورے کرنے تھے اور دوسری طرف انھیں کفار سے لڑ کر سرزمین عرب میں خدا کے دین کو غالب کرنا تھا۔ اس راہ میں ایک طرف اپنے مال، تجارت وزراعت اور سب سے بڑھ کر جان کی قربانی دینی تھی اور دوسری طرف جن کفار سے لڑنا تھا، ان میں ان کے باپ، بھائی، بیٹے اور دیگر رشتہ دار بھی تھے۔ چنانچہ مال واسباب اور رشتے ناتوں کی یہی وہ محبت تھی جس کے تقابل کے طور پر اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کو پیش کر دیا گیا۔ مطلب یہ تھا کہ جس خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو اور مانتے ہو کہ جہاد کا نتیجہ خدا کی جنت ہے تو پھر اس ایمان کا مطلب یہ ہے کہ ان محبتوں سے بڑی محبت کوئی نہیں ہونی چاہیے، چاہے وہ تمھیں کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو۔

یہی وہ چیز ہے جس کی شرح و وضاحت میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بار آپ نے ارشاد فرمایا:

”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ، اس کے بیٹے اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔“ (بخاری، رقم ۱۵۔ مسلم، رقم ۴۴)

اِس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی محبت ایک اصولی محبت ہے جو ایمان سے پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ خدا اور اس کے رسول کے بالمقابل اگر دیگر محبتیں آکر کھڑی ہو جائیں اور اپنے وہ مطالبات پیش کر دیں جو دینی تقاضوں کے بر خلاف ہوں تو پھر ترجیح اللہ اور اس کے رسول کو ہونی چاہیے، ورنہ ایمان معتبر نہیں ہوگا۔

بد قسمتی سے ہمارے ہاں قرآن و حدیث میں محبت کا یہ تصور سمجھے بغیر مطلقاً محبت کو دین کی دعوت بنا کر معاشرے میں پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ محبت تو پیدا ہو جاتی ہے، مگر اس کے ساتھ خالص ایمان ہوتا ہے، نہ کامل اتباع۔ صرف شاعرانہ تعلی اور خطیبانہ دعوے ہوتے ہیں جن سے خون تو گرم ہو جاتا ہے، مگر مفادات وخواہشات کی ایک چھوٹی سی قربانی بھی ایسا شخص نہیں دے پاتا۔ بد عملی خوب فروغ پاتی ہے۔ غلو و شرک پر مبنی شاعری وجود میں آجاتی ہے۔ دین میں اضافے اور بدعتیں جنم لیتی ہیں۔ عشق کے نام پر دوسروں کی نفرت، گستاخی کے فتوے، قانون کی پامالی اور بے گناہوں کے قتل کا چلن عام ہو جاتا ہے، مگر حقیقی دین داری کا نام و نشان نہیں ملتا۔ بہت ہوا تو کچھ ظاہری وضع قطع اور رسمی دین داری وجود میں آجاتی ہے۔ بد قسمتی سے محبت کے نام پر یہی ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

قرآن و حدیث کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ دین کی اصل دعوت ایمان ہے اور محبت اس ایمان کا فطری نتیجہ ہے۔ چنانچہ لوگوں میں محبت اگر نظر نہ آئے یا کم نظر آئے تو یہ ایمان میں کمی کی علامت ہے۔ ایسی حالت میں دعوت ایمان کی دینی چاہیے۔ بتانا چاہیے کہ محبت کے دعووں کو جانچنے کا معیار اتباع رسول ہے۔ اپنی خواہشات، مفادات اور تعلقات پر اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو ترجیح دینا ہے۔ یہی سچے اہل علم کے کرنے کا اصل کام ہے۔ اس سے ہٹ کر کچھ کرنے کا نتیجہ خدا کے حضور اپنی پکڑ اور دوسروں کی گم راہی کا سبب بنے گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد ذکوان ندوی

ز چشم آستین بردار

ہمارے محلے کے ایک پڑوسی (فیروز احمد خان) مدینہ منورہ میں مقیم ہیں۔ اِس بار وہ چھٹیوں پر لکھنؤ تشریف لائے تو ہم نے ''استقبال زائر مدینہ'' کے عنوان سے اپنے ادارہ (وزڈم فاؤنڈیشن، لکھنؤ) میں ایک پروگرام منعقد کیا۔ اِس موقع پر کسی رنگ آمیزی کے بغیر بالکل فطری انداز میں لوگوں کے سامنے اسوۂ نبوی اور پیغمبرانہ سیرت کے واقعات بیان کرتے ہوئے اُن کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، قرآن مجید سے تعلق اور آپ کی پیروی واتباع کا جذبہ بیدار کرنے کی کوشش کی گئی۔

ایک خاص بات کی طرف متوجہ کرتے ہوئے حاضرین کو بتایا گیا کہ 'نسبتیں' عشق و محبت کی اساس ہوا کرتی ہیں۔ یہی نسبت ایک عام چیز کو 'شعائر اللہ' (البقرہ ۲: ۱۵۸) کے اُس بلند مقام پر فائز کر دیتی ہے جس کی 'تعظیم' (الحج ۲۲: ۳۲) نہ صرف ایک مومن کے لیے ضروری، بلکہ وہ اُس کے باطنی تقویٰ وایمان (تَقْوَی الْقُلُوْبِ) کی علامت ہوا کرتا ہے۔ اِس اعتبار سے دیکھیے تو رسول کی نسبت اللہ سے ہے اور مدینے کی نسبت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے۔ چنانچہ اللہ اور رسول سے نسبت رکھنے والی ہر چیز ہمارے لیے غایت درجہ محبت اور عقیدت کا درجہ رکھتی ہے۔

اِس موقع پر بچوں نے حمد ونعت پر مبنی بامعنی اور خوب صورت کلام بھی پیش کیا۔ اُنھیں انعام اور شیرینی کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ محلے والوں سے میں نے کہا کہ مدینہ منورہ کی عظیم نسبت کا تقاضا ہے کہ آپ حضرات مذکورہ پڑوسی کو اپنے گھر پر مدعو کریں۔ اُن سے اظہارِ محبت کریں اور مدینے کے حالات و واقعات کا علم حاصل

کریں۔ اِسی طرح اُن کی روانگی کے دن (۲۲؍ جنوری ۲۰۲۲ء) میں نے لوگوں کو تاکید کی کہ آپ اُن سے مل کر اپنا سلام حضور رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) میں پہنچائیں۔ میں نے کہا: افسوس کہ نسبتوں کے لحاظ و احترام کا یہ مبارک ماحول اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ دل کی اِسی تاریکی اور قلب و ذہن کی اِسی ویرانی پر ماتم کرتے ہوئے شاعر حقیقت علامہ اقبال نے کہا تھا:

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے!

چنانچہ راقم کی دعوت پر مذکورہ پڑوسی ہمارے ہاں تشریف لائے۔ روانگی کے وقت میں نے اپنے بچے ابراہیم (۶ سال) سے کہا: تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی ہدیہ نہیں بھیجو گے؟ وہ اپنے معصومانہ انداز میں بولا: میں حضور پاک کے لیے عطر بھیج دوں؟ میں نے کہا: ضرور۔ چنانچہ گلاب کا عطر اُن کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ابراہیم نے کہا: یہ ہماری طرف سے حضور پاک کے لیے ہدیہ ہے۔ میں نے مذکورہ پڑوسی سے کہا: اب آپ روضۂ رسول پر یہی عطر مل کر حاضر ہوں۔ اِن شاء اللہ یہی اِس نذرانۂ عقیدت کی قبولیت و باریابی کا ذریعہ ثابت ہو گا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

یہ واقعہ گویا مشہور فارسی شاعر ملک الشعرا محمد تقی بہارؔ (وفات: ۱۹۵۱ء) کے الفاظ میں ''فرزندِ مرا عشق بیاموز و دگر ہیچ'' جیسا ایک معاملہ تھا۔ یہ ایک قلب معصوم کے اندر محبت رسول کی تخم ریزی تھی، جس سے بڑی کوئی دولت نہیں۔ یہ محبت ہی زندگی کا حاصل اور دین کا خلاصہ ہے۔ جس دین میں محبت اور ربانی و ایمانی کیفیات شامل نہ ہوں، وہ دین نہیں، بلکہ صرف ایک بے روح 'مذہب' ہے، جو خدا اور انسان، دونوں کے یہاں قابل رد ہے۔ قرآن مجید میں اِسی بے روح 'مذہبیت' کو 'قساوت' (الحدید ۵۷: ۱۶) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی غفلت و 'قساوت' اور یہی بے خوفی تمام مادی اور روحانی فتنوں کا سبب ہے۔

ایک واقعہ

اِس موقع پر مجھے ندوۃ العلما، لکھنؤ کے دور طالب علمی کا ایک واقعہ یاد آیا۔ یہ ۱۹۹۷ء کی بات ہے۔ اُس وقت میں اپنے خرچ کے لیے عام طور پر فارغ اوقات میں خطاطی کیا کرتا تھا۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ فرط شوق میں، میں نے مولانا سے عرض کیا کہ میں

اپنے نام کے ساتھ سلام لکھ کر آپ کو دوں گا۔ آپ اُسے حضور رسالت مآب میں پیش فرما دیں۔ مولانا خوش ہوئے اور فرمایا: ضرور۔ چنانچہ میں نے لفافے ہی کے سائز کا ایک آرٹ پیپر لیا تاکہ مڑ کر وہ بدنما نہ ہونے پائے۔ درمیان میں سلام لکھ کر کاغذ کے چاروں طرف سرخ روشنائی سے خط دیوانی میں اِس طرح درود ابراہیمی لکھا گیا تھا کہ وہ حاشیے کا ایک خوب صورت ڈیزائن معلوم ہونے لگا۔ اِس سپاس نامہ و لفافے کا عکس آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ سلام کے الفاظ یہ تھے:

الصلاة والسلام علیک یا رسول الله، من محمد ذکوان بن عثمان بن بشیر.

لفافے پر بطور سرنامہ جلی حروف میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

”ایک گداے بے نوا کا نذرانۂ عقیدت و محبت شہنشاہ کونین کے نام“

اِس سرنامہ کے نیچے حزین لاہیجی (وفات: ۱۱۸۰ھ) کا درج ذیل فارسی مصرع رقم تھا:

ز چشمم آستین بردار و گوہر را تماشا کن! *

تاہم میں جب مولانا کی قیام گاہ، مہمان خانہ، ندوۃ العلما پہنچا تو معلوم ہوا کہ مولانا ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہو چکے ہیں، مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ عین اُسی وقت لکھنؤ کے کچھ مقامی لوگ بذریعۂ کار مولانا سے ملاقات کے لیے ندوے پہنچے۔ اُنھیں معلوم ہوا تو وہ ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں بھی اُنھی کے ساتھ ایئرپورٹ چلا گیا۔ اُس وقت اِس قدر سیکورٹی وغیرہ کا مسئلہ نہیں تھا۔ چنانچہ ہم لوگ ایئرپورٹ کے اندر چلے گئے۔ یہاں پہنچا تو دیکھا کہ مولانا ابھی رخصت نہیں ہوئے ہیں۔ چنانچہ مولانا کی خدمت میں یہ لفافہ پیش کرتے ہوئے اپنا سلام شوق عرض کرنے کی درخواست کی۔ مولانا گلوگیر ہو کر دعا فرمانے لگے۔ بالآخر واپسی پر میں اُنھی حضرات کے ساتھ دوبارہ ندوے آ گیا۔

اُس وقت فرط شوق کی وجہ سے مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ چنانچہ مدینہ منورہ سے واپسی کے کئی دن بعد ہی میں مولانا سے ملاقات کی ہمت کر سکا۔ حاضر ہوا تو مولانا نے فرمایا کہ میں نے روضۂ رسول پر تمھارا لفافہ پڑھ کر سلام پیش کر دیا تھا:

---

* یہ دراصل اُس واقعے کی تعبیر ہے جب ایک شخص شدت گریہ کے دوران میں اپنی آنکھوں کو آستین سے ڈھک کر اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اِسی بات کو شاعر نے اِس طرح بیان کیا ہے کہ ”تم میری آنکھوں سے آستین ہٹاؤ، پھر دیکھو کہ اِن سے اشک ہاے درد و محبت کے گوہر کس قدر رواں ہیں۔“

برایں مژدہ گر جان فشانم، رواست!

اِس خوش خبری کو سننے کے بعد دیر تک میں زیر لب یہ اشعار گنگناتا رہا:

جان می دہم در آرزو اے قاصد، آخر باز گو

در مجلسِ آن نازنین حرفی کہ از ما می رود!

''اے قاصد، میں اِس بات پر اپنی جان نثار کر دوں۔ آخر یہ بتا کہ محبوب کی اُس مجلس میں گفتگو کے دوران میں کیا میرا نام بھی لیا گیا!؟۔''

بہر سلام مکن رنجہ در جواب آں لب

کہ صد سلامِ مرا بس یکی جواب از تو!

''ہر سلام کا جواب دینے کی زحمت نہ فرمائیں کہ سیکڑوں سلام کا بس آپ کی طرف سے ہمارے لیے ایک ہی جواب کافی ہو گا!۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خلاصۂ کلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ایمان بالرسول کا وہ بدیہی تقاضا ہے جو آپ کی نسبت سے ایک سچے مومن کے اندر فطری طور پر موجزن ہوا کرتا ہے۔ میڈیا سونامی کے اِس دور میں، جب کہ عام طور پر 'بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ' (الحج ۲۲: ۸) کے مصداق، بہت سے 'مذہبی' اور غیر 'مذہبی' فلسفہ و افکار کی اشاعت دن رات جاری اور اُن کے بانی علما و مفکرین سے ایسی والہانہ محبت اور عقیدت کا ثبوت دیا جارہا ہے جو صرف اللہ اور رسول کا حصہ ہے (البقرہ ۲: ۱۶۵)۔

اِس صورت حال میں ضرورت ہے کہ ہر قسم کی گروہ بندی اور مسلک پرستی سے بلند ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبی تعلق قائم ہو اور ہر جگہ آپ کی سیرت اور آپ کی تعلیمات کا اِس کثرت کے ساتھ تذکرہ کیا جائے کہ وہی وقت کا غالب موضوع بن کر تمام فلسفہ ہاے حیات پر چھا جائے۔

ایمان و محبت کی اِس عظیم دعوتی اور ربانی مہم کو عمومی بنانے کے لیے ضروری ہو گا کہ ہر جگہ تذکیر بالقرآن، سیرت نبوی اور اُسوۂ صحابہ کے سنجیدہ دعوتی اور تربیتی حلقے قائم کیے جائیں۔ آپ کی سنت اور آپ کی سیرت سے بڑھ کر کوئی 'فکر و فلسفہ' اور آئیڈیالوجی (ideology) نہیں جو انسانیت کے لیے حیات بخش ثابت ہو۔ شخصی

'آئیڈیالوجی' اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، اکثر 'خیال پرستی' ہوا کرتی ہے، وہ وحی الٰہی پر مبنی کوئی نظریۂ حیات نہیں۔ لہٰذا خدا کی کتاب اور اُس کے پیغمبر سے بڑھ کر دوسری اور کوئی چیز نہیں جو ہمارے لیے محبت و اتباع کا مرکز اور ربانی ہدایت کا مستند خدائی ماخذ بن سکے۔

[لکھنؤ، ۲۵ر مئی ۲۰۲۲ء]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تجھے آغوش میں لینے کو آئی رحمت باری
تجھے فردوس میں اماں سے حوریں ہوگئیں پیاری

تری یادوں کے برزخ میں یہ صبح و شام گزریں گے
رہے گی آرزو بن کر تری محشر میں بیداری

(غامدی)

www.javedahmadghamidi.com

نوشیروان غامدی

کا سانحۂ ارتحال

سید منظور الحسن

پوتے کی وفات پر غامدی صاحب کے تاثرات

(محمد حسن الیاس صاحب کے ساتھ اُن کی گفتگو سے ماخوذ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmedghamidi.com

نوشیروان ہمارا لختِ جگر تھا، ہم پر اللہ کا انعام تھا۔ جب تک رہا، اللہ کا کرم اور اُس کی عنایت بن کر رہا۔ اب وہ ہم سے رخصت ہو گیا ہے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اُس کے چلے جانے پر رنج بھی ہوا ہے، تکلیف بھی پہنچی ہے، آنسو بھی ٹپکے ہیں۔ —— یہ سب اُس محبت ورحمت کا فطری اظہار ہے، جو اللہ نے انسانوں کے دلوں میں رکھی ہے —— اپنے رب سے کوئی جزع فزع نہیں ہے۔ اُس نے اُسے عارضی مدت کے لیے بھیجا تھا، مدت پوری ہوئی تو واپس بلا لیا ہے۔ اُس کی زندگی کی نعمت بھی عارضی تھی اور اُس کی موت کا غم بھی عارضی ہے۔ جس طرح یہ زندگی عارضی ہے، اُسی طرح اِس کی خوشیاں اور غم بھی عارضی ہیں۔ اصل اور مستقل زندگی وہ ہے، جو موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ وہ زندگی موت کے دروازے سے گزر کر ملتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی اور اپنے عزیزوں کی موت کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

ماں باپ کے لیے اِس سے بڑا کوئی امتحان نہیں ہو سکتا کہ اُنھیں اپنے بچے کو اپنے بازوؤں میں لے کر دفن کرنا پڑے۔ میں نے خود اپنی کم سن بیٹی کی قبر کھودی اور اُسے اپنے ہاتھوں سے دفن کیا ہے۔ یہ آسان چیز نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے جو شفقت باپ میں رکھی ہے، جو محبت اور ممتا کے احساسات ماں میں رکھے ہیں، وہ اتنے قوی، اتنے غیر معمولی ہوتے ہیں اور اِس طرح انسان کے وجود کا احاطہ کر لیتے ہیں کہ جب اِن سب کے باوصف اللہ تعالیٰ بچے کی نعمت لے لیتا ہے تو اُسے برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ کا سہارا اور آخرت پر

ایمان ہی صبر دیتا ہے۔اِس لیے ایسے موقع پر ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ 'اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ*'، ''ہم اللہ ہی کے لیے ہیں، اللہ کی طرف لوٹیں گے''۔ اِسی طرح حدیث میں آتا ہے: 'إنَّ لِلَّه ما أَخَذ ولَهُ ما أَعطَى'، یعنی جو اُس نے لے لیا ہے، وہ اُسی کا تھا اور جو اُس نے دیا، وہ بھی اُسی کا ہے۔ پھر یہی نہیں ہے، اِس کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ 'وكُلُّ شَيءٍ عِنده بِأجَل مُسمًّى**'، یعنی میرے لیے، آپ کے لیے، میرے احوال کے لیے، آپ کے احوال کے لیے، ہر معاملے کے لیے ایک اجل، ایک موت مقرر کر دی گئی ہے، جسے ہر حال میں آنا ہے۔ جب یہ مقرر ہے اور اِسے بہر حال آنا ہے تو پھر اِس کا استقبال کرنا چاہیے، اِسے خندہ پیشانی سے قبول کرنا چاہیے۔

آپ جانتے ہیں کہ اللہ نے انسانوں کی تذکیر کے لیے اپنی کتابیں نازل کی ہیں، اپنے پیغمبر بھیجے ہیں۔ اِسی طرح دنیا میں جو مختلف واقعات اور حوادث پیش آتے ہیں، اُن میں بھی اصلی مقصود یہی تذکیر، یہی تنبیہ، یہی یاد دہانی ہوتی ہے۔ اِس بچے کا وجود بھی ہمارے لیے اللہ اور آخرت کی یاد دہانی کا باعث تھا۔ آٹھ، ساڑھے آٹھ سال تک ایک امتحان کی زندگی تھی، جو اُس نے بھی بسر کی اور ہم نے بھی بسر کی۔ یہ امتحان ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت تھا۔ اُس کی عنایت کو دیکھنے کے دسیوں مواقع ہمارے سامنے آتے تھے۔ اُس کی شخصیت، اُس کی زندگی، اُس کے شب و روز ہمارے لیے تذکیر کا باعث بنتے تھے۔ اِس دنیا میں ہمیں کیا رویے اختیار کرنے چاہییں، اُن کی رہنمائی ملتی تھی۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی امتحان میں ڈالے تو اُس میں کیا کیا مراحل آ سکتے ہیں، اُن کی بھی ایک کتاب کھل جاتی تھی۔ چنانچہ وہ سراپا نعمت تھا۔ اللہ تعالیٰ کی اِس سے بڑی نعمت کیا ہو سکتی ہے کہ ایک بچے کی خدمت، اُس کی محبت، اُس کے ساتھ تعلق خاطر آپ کے لیے جنت کا سامان کر رہے ہوں اور اُس کی زندگی اور اُس کے احوال آپ کے لیے اللہ اور اُس کے قانون کی یاد دہانی کا ذریعہ بن رہے ہوں۔ اِن تمام پہلوؤں سے وہ ہمارے لیے نعمت ہی نعمت تھا۔

اُس کے ماں باپ کو اللہ تعالیٰ نے موقع دیا کہ وہ صبر اور استقامت کے ساتھ اُس کے معاملات کو دیکھیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ دونوں نے اِس موقعے کو نہایت خوبی سے نبھایا۔ باپ کی شفقت غیر معمولی تھی، مگر ماں نے تو اپنی زندگی اُس کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ماں کیا ہوتی ہے، ماں کے جذبات کیا ہوتے ہیں، ماں کی ممتا چیز کیا

---

* البقرہ ۲:۱۵۶۔

** نسائی، رقم ۱۸۶۸۔

ہے، اُس کے شب و روز میں اِس کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔ میں یا آپ ہو سکتا ہے کہ کسی موقعے پر گریز بھی کر جائیں، لیکن وہ تو اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کسی حال میں اپنے ماتھے پر شکن نہیں آنے دیتی تھی۔ پوری محبت اور دل جوئی کے ساتھ اُس کی خدمت کرتی تھی۔ بہر حال، اِن دونوں کو اللہ نے جس امتحان سے گزارا ہے، وہ چونکہ بڑا غیر معمولی ہے، اِس لیے اگر وہ صبر کریں، جزع فزع نہ کریں، اپنے رب پر بھروسا رکھیں، ہمت کے ساتھ آگے بڑھیں تو اِس کا صلہ جنت ہے۔ ایسے موقعوں پر راضی بہ رضا رہنا معمولی درجے کا عمل نہیں ہوتا، اِسی لیے اِسے 'صبر' سے تعبیر کیا ہے اور اِس کا صلہ ابدی جنت رکھا ہے۔ یہ صبر ہی ہے کہ جس کے بارے میں اللہ نے یہ بشارت دی ہے کہ دنیا میں میری معیت صابرین کو حاصل ہو جاتی ہے* اور آخرت کے حوالے سے تو یہ بتا دیا ہے کہ 'جَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا'**، یعنی جنت ہے ہی اصل میں صبر کا صلہ۔

ہمارا یہ بچہ ہفتہ بھر موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا رہا۔ اِس دوران میں بہت سے لوگوں نے ہم سے رابطہ کیا، ہمارے ساتھ محبت کا اظہار کیا، بچے کا حال پوچھا، اُس کے لیے دعا کی، ہم اُن سب کے بہت شکر گزار ہیں۔ اب جب کہ وہ دنیا سے رخصت ہو گیا ہے تو لوگ تعزیت کر رہے ہیں، ہمارے غم میں شریک ہیں، ہم اِس پر بھی حد درجہ شکر گزار ہیں۔ اُن سے درخواست ہے کہ وہ بچے کے ماں باپ کے لیے، اُس کے بہن بھائیوں کے لیے سکینت کی دعا کریں تاکہ جس غم سے وہ گزرے ہیں، جس صدمے سے دو چار ہوئے ہیں، جس نعمت سے محروم ہوئے ہیں، اُس کے بعد اللہ تعالیٰ اُنھیں وہ اطمینان اور سکون عطا فرمائے کہ وہ اپنی باقی زندگی اپنے رب کی طرف متوجہ ہو کر گزار سکیں۔ اِس لیے کہ رب کی طرف توجہ، اُس کی جانب رجوع، اُس کی رضا پر راضی رہنا، یہی دین ہے، یہی ایمان ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے یہ چیز پالی، اُس نے ایمان کی حلاوت چکھ لی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اِس حادثے کے نتیجے میں اُنھیں ایمان کی یہی حلاوت نصیب فرمائے۔ آمین

---

* البقرہ ۲: ۱۵۳۔

** الدہر ۷۶: ۱۲۔

سید منظور الحسن

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

کچھ نفوس صرف امرِ ربی کو پورا کرنے کے لیے دنیا میں آتے ہیں۔ یہ پروردگار کے کارکنان ہوتے ہیں، جو خاص ذمہ داریوں کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ اِنھیں دوسروں کی آزمایش پر مامور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ اُن کی تعلیم و تربیت، تنبیہ و تذکیر اور ہدایت و نصیحت کا سامان کرتے اور نتیجتاً تزکیہ و تطہیر کا باعث بنتے ہیں۔ اِس اعتبار سے اِن کا وجود آیۃٌ من آیاتِ اللہ ہوتا ہے — خدا کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی — چنانچہ یہ ستارے کی طرح نکلتے اور افلاک کی راہ دکھا کر او جھل ہو جاتے ہیں، بادل کی طرح برستے اور زمین کو سیراب کر کے تحلیل ہو جاتے ہیں، پھول کی طرح کھلتے اور فضا کو مہکا کر مرجھا جاتے ہیں، دیے کی طرح جلتے اور ماحول کو جگمگا کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ یہ خدا کی معرفت اور قربت کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ لوگ اگر حق شعار اور حکمت شناس ہوں تو اِن کا وجود اُن پر اللہ کے انعام و اکرام کے دروازے کھول دیتا ہے اور پھر اُنھیں اپنی بخشش اور نجات کے لیے کسی اور جانب دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اِنھی کارکنانِ قدرت، اِنھی کروبیانِ رحمت، اِنھی فرد ستگانِ خاک اور — اِنھی بلاکشانِ محبت — میں سے ایک نوشیروان غامدی بھی تھا۔ وہ اللہ کے حکم کے عین مطابق اپنی ذمہ داریاں انجام دے کر ۷/ اکتوبر ۲۰۲۲ء کو دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ آٹھ برس تک جیا اور اِن تمام برسوں میں مبتلاے آزار رہا۔ اُس کے ساتھ کئی عوارض وابستہ تھے۔ تنفس کا عارضہ، دل کا عارضہ، جگر کا عارضہ، حد درجہ ناتوانی کا عارضہ اور سب سے بڑھ کر اپنی تکلیف نہ بتا سکنے کا عارضہ۔ وہ اِن غموں کو ایسے سہتا رہا، جیسے — غم کو سہنے میں بھی قدرت نے مزہ رکھا ہے — مگر کبھی

اُنھیں بیان نہیں کر پایا۔ شاید اپنے دادا کی طرح اِس کا حوصلہ نہیں کر سکا:

روح و بدن، دل و جگر، زخم کہاں کہاں نہیں!

کس سے کہوں یہ ماجرا، حوصلۂ بیاں نہیں!

اُس کا یہ سکوت پہاڑوں کو لرزا دینے والا اور دریاؤں کو دو نیم کر دینے والا تھا۔ اِس لیے پہاڑوں اور دریاؤں جیسا دل رکھنے والا اُس کا باپ بھی تڑپے بغیر نہ رہ سکا اور سات سال کے جاں گسل انتظار کے بعد بالآخر گڑ گڑا اٹھا۔ اُس کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے:

"... بھئی بات یہ ہے کہ اگر اللہ میاں ہم سے براہِ راست رابطے میں ہوتے تو ہم اُن کا ہاتھ پکڑ لیتے، گھٹنوں پر بیٹھ جاتے، سر اُن کے قدموں میں رکھ دیتے اور بس اتنا کہتے کہ تمھیں اتنی سی زبان دے دے کہ تم اپنی تکلیف بتا سکو۔ اتنا تڑپنا اور بتا بھی نہ سکنا کہ ہوا کیا ہے!"

زمانی لحاظ سے اُس کا عرصۂ حیات آٹھ برس ہے۔ لیکن جو زندگی وہ جیا، اُس میں گھڑیاں مہینوں کی، مہینے برسوں کے اور برس صدیوں کے ہو جاتے ہیں، اِس لیے ہم نہیں جانتے کہ وہ اصل میں کتنی مدت تک جیتا رہا۔ اِس کا شمار وہ خود کر سکتا ہے، اُس کا باپ کر سکتا ہے یا سب سے بڑھ کر اُس کی ماں کر سکتی ہے۔ دیکھیے، اُس کی موت پر باپ نے کیا لکھا ہے:

"... شیرو، تم ہنستے کھیلتے تھے، بھاگتے دوڑتے تھے، مگر تکلیف میں تھے؛ ایک دو دن نہیں، پورے آٹھ سال۔ آخری پانچ دن تو تکلیف حد سے گزر گئی تھی۔ ہاتھ اٹھے کہ مالک، میں نہ یعقوب ہوں، نہ ابراہیم؛ میرا صبر یوں نہ آزما کہ ٹوٹ جاؤں۔... شیرو تم ایک امید کی طرح ابھرے، اور ڈھل گئے۔ شیرو، سنتے ہو تو سنو، ماں کی آنکھ میں تم اب بھی بھاگتے دوڑتے موجود ہو۔ اُس نے برسوں تمھارے ہی ساتھ بتائے ہیں۔ اُس کے شب و روز تم سے عبارت تھے، سو اب بھی ہیں۔ اِس کے لیے مشکل یوں بھی ہے کہ یار، اُس کی آنکھ صبح کھلتے ہی تمھیں دیکھتی اور رات تمھیں دیکھ کر ہی بند ہوتی تھی۔ اب جب کچھ وقت کو دور ہوئے ہو تو کیا کہے، کیا کرے۔ مگر خدا کی بندی ہے، خدا کے سوا اُس کی امید کچھ تھی نہیں اور اب بھی روشنی وہیں سے پاتی ہے۔ کہتی ہے: تم تب تک اُس سے جدا ہو، جب تک وہ زندہ ہے۔"

وا دریغا، باپ کہتا ہے کہ مالک، میرا صبر یوں نہ آزما کہ ٹوٹ کر بکھر جاؤں اور ماں کا کہنا ہے کہ میں تب تک اُس سے جدا ہوں، جب تک میں زندہ ہوں۔ گویا اب زندگی بھر بس موت کا انتظار کرنا ہے:

ای دریغا ای دریغا ای دریغا ای دریغ

نوشیروان جہاں سے آیا تھا، وہاں واپس چلا گیا۔ وہ اب ہم میں نہیں ہے۔ وہ خدا کا خاص بندہ تھا۔ اُس نے بلا چون وچرا اپنے رب کے ارشاد کی تعمیل کی۔ اُس کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی مالک کی اطاعت سے خالی نہیں رہا۔ اُس کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، زندہ رہنا اور مر جانا، سب اللہ پروردگارِ عالم کے لیے تھا۔ وہ عیبوں سے مبرا اور گناہوں سے پاک ایک نفس مطمئن تھا، اِس لیے راضیۃً مرضیۃً کی بادشاہی کا حق دار ہے۔ اُس کی زندگی بھر کی تکلیفوں کے صلے میں اُسے ابدی زندگی ملے گی۔ وہ زندگی جس کے لیے وہ اِس جیسی ہزار زندگیاں بھی گزارنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔

تاہم، یہ آخرت کا زاویۂ نظر ہے، جس کے برحق ہونے میں کوئی انکار نہیں ہے۔ مگر اِس کے ساتھ ایک دنیا کا زاویۂ نظر بھی ہے، جو محدود ہونے کے باوجود اپنی جگہ حقیقت ہے۔ ایک دل خراش حقیقت۔ اُس زاویے سے دیکھیں تو منظر نامہ یہ ہے کہ وہ خاموشی سے آیا اور خاموشی سے چلا گیا۔ جب تک رہا، درد سہتا رہا، —— ایسے درد جو پہاڑوں کو سہنے پڑیں تو وہ بھی الحذر، الامان پکار اٹھیں —— مگر وہ اُنھیں چپ چاپ سہتا رہا۔ یہ بتایا ہی نہیں کہ وہ کہاں اٹھتے ہیں اور کس شدت سے اٹھتے ہیں۔ یہ پوچھا ہی نہیں کہ اُس زندگی کے کیا معنی ہیں، جس میں روح وبدن کے زخم ہر دم تازہ رہتے ہیں! یہ سوال ہی نہیں کیا کہ ایسی دنیا میں کب تک رہوں، جس میں نہ زمانے ہیں، نہ موسم ہیں، نہ رنگ ہیں! یہ کہا ہی نہیں کہ اُس عمر کا کیا کروں، جسے میرے بجائے دوسرے بسر کرتے ہیں! ... بامروت تھا، عالی ظرف تھا، بلند ہمت تھا، اِس لیے کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ جاتے جاتے زبانِ حال سے بس اتنا سمجھا گیا کہ:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!
غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں!

جواد احمد غامدی

نوشیروان غامدی (شیرو) کے نام آخری خط

رکے ہوئے کو وقت کیوں کہوں میں۔ چلتا ہے، یوں وقت ہے۔ آرزو کا سانس حرکت ہے، اور حرکت کو خود سانس کی خواہش۔ اب خواہش سے پھوٹتا چشمہ زندگی، تو زندگی بڑھتی رہے، مگر چشمہ موت میں غرق ہو گا۔ کر لو جو کرنا ہے۔ جہاں چاہے سر مارے۔ حیات کا دامن بھیگے یا بچ بچ کر جیے۔ اُس کو بالآخر موت کے اندھیرے کنویں میں غرق ہو ہی جانا ہے۔ تو حقیقت نہ زندگی ہے نہ سانس، حقیقت موت ہے کہ باقی سب کچھ اُسی کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

شیرو کو کل گھر سے دور ایک پر سکون سے ویرانے میں خدا کے سپرد کر دیا۔ لوگ پوچھتے رہے کہ اتنی دور؟ شیرو دور ہو کر بھی پاس ہے۔ وہ ہنستا، کھیلتا، اٹھکھیلیاں کرتا میرے اندر زندہ ہے۔ اُس کے لاپروا قہقہے اور شرارتیں۔ وہ بھاگتا تو سارا گھر دوڑ پڑتا؛ وہ ہنستا تو ہم کھل اٹھتے؛ وہ رک جاتا تو ہمارا وقت بھی ساعتوں کی پوٹلی باندھ کر اس کے سرہانے ٹھیر جاتا۔

کیا کہوں، شیرو میرے لیے محض ٹھنڈی مٹی نہیں ہے، جو قبرستان میں پڑی ہے، وہ میرے گھر کے ہر کونے میں موجود ہے۔ وہ میرے گھر کی فضاؤں میں رچا بسا ہے۔ سامنے کی دیوار پہ لکھا ہوا ہے اور ہر دروازے پہ مہک رہا ہے۔ مجھے اُس ٹھنڈی مٹی پر شیرو سے ملنے کے لیے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

آخری چند دن تکلیف دہ تھے، جب وہ خاموش ہو کر لیٹ گیا تھا۔ وہ ایک سیل رواں تھا؛ رکنا، ٹھیر جانا اُس کی سرشت نہیں تھی۔ ایک چھلاوا سا تھا؛ پل میں یہاں پل میں وہاں۔ موج کی طرح ہر دم بپھرا ہوا رہتا۔ کشش ثقل کے مانند محبتوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔ آنکھوں میں ایک طرح کی بے باکی تھی۔ اُس کی اپنی زبان تھی، جو کوئی

نہیں بول سکتا تھا۔ میرے پاس اُس کے آخری چہرے کی کوئی تصویر نہیں۔ وہ اُس کا چہرہ نہیں تھا۔

اُس کے ساتھ گزرے آٹھ سال، شاید بہت سی آزمایشوں میں امید کا کوئی غیبی سا احساس تھا۔ میں روز اُسے گلے لگا کر اُس سے انرجی لیتا اور گھر سے نکلتا۔ وہ ہمارا معمول تھا۔ ہمارے سونے اور جاگنے کا وقت تھا۔ ہر تجویز کا مرکز تھا، ہر منصوبے کا محور تھا۔ اُس کو اندھیروں سے نفرت تھی۔ گھر کا ہر قمقمہ اُس کے لیے جاگتا رہتا تھا۔ وہ کبھی ایک بتی نہیں جلاتا تھا، سوئچ بورڈ پر لگے ہر بٹن کو آن کر کے ہی اُس کو آرام آتا تھا۔ جب دینے والے کو شیرو کا جسد خاکی سپرد خاک کر رہے تھے تو خیال آرہا تھا کہ اُسے تو اندھیرے بالکل پسند نہیں ہیں، پھر یاد آیا کہ اُس کی اپنی انرجی اور روشنی بھی تو کم نہیں تھی۔ زمین کے نیچے ہر سوئچ آن ہو چکا ہو گا؛ قبر منور ہو چکی ہو گی۔

شیرو!

تم میری گاڑی میں پچھلی سیٹ پر ماں کی گود میں تھے۔ میٹر پر تمھاری پلس ختم ہو چکی تھی؛ میں، تمھارا بھائی اور تمھاری ماں اُس کے صفر ہو جانے کے نو منٹ بعد ہسپتال پہنچے تھے۔ ڈاکٹر نے پلس دیکھی صفر، بلڈ پریشر دیکھا صفر، شوگر دیکھی صفر۔ میں، تمھاری ماں، تمھارا بھائی، معاذ چاچو، افشاں خالہ، حسنین چاچو، منیر دادا، اور سعدیہ دادی باہر کھڑے تمھیں ایک بار پھر دیکھنا چاہتے تھے۔ ہاتھ اٹھے ہوئے تھے۔ دل ڈوب رہا تھا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور ٹانگیں ہمارا بوجھ اٹھانے سے انکار کر رہی تھیں، مگر امید زندہ تھی۔ خدا سے امید بھلا کب ختم ہو سکتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تم ہنستے کھیلتے تھے، بھاگتے دوڑتے تھے، مگر تکلیف میں تھے؛ ایک دو دن نہیں، پورے آٹھ سال۔ آخری پانچ دن تو تکلیف حد سے گزر گئی تھی۔ ہاتھ اٹھے کہ مالک، میں نہ یعقوب ہوں، نہ ابراہیم؛ میرا صبر یوں نہ آزما کہ ٹوٹ جاؤں۔ وہ کہاں، میں کہاں۔ یعقوب روتے تھے تو اُن کے آنسو خاک پر نہیں تیرے در پر گرتے تھے۔ میں روؤں تو خاک بھی قبول نہیں کرتی کہ اندر کا پانی گناہ آلود ہے۔

تمھاری ماں بہت پریشان ہے۔ اُس کی ذات میں تم ہی تم رچے بسے ہوئے تھے۔ گئے ہو تو لگتا ہے، اُس کے اندر سے کوئی دل کھینچ کے نکال لے گیا ہے، مگر خدا سے اُس کی امید تھی؛ وہی اُس کے صبر کا سامان کرنے والا ہے۔ شیرو تم ایک امید کی طرح ابھرے، اور ڈھل گئے۔ شیرو، سنتے ہو تو سنو، ماں کی آنکھ میں تم اب بھی بھاگتے دوڑتے موجود ہو۔ اُس نے برسوں تمھارے ہی ساتھ بتائے ہیں۔ اُس کے شب و روز تم سے عبارت تھے، سو اب بھی ہیں۔ اُس کے لیے مشکل یوں بھی ہے کہ یار، اُس کی آنکھ صبح کھلتے ہی تمھیں دیکھتی اور رات

تمھیں دیکھ کر ہی بند ہوتی تھی۔ اب جب کچھ وقت کو دور ہوئے ہو تو کیا کہے، کیا کرے، مگر خدا کی بندی ہے، خدا کے سوااُس کی امید کچھ تھی نہیں اور اب بھی روشنی وہیں سے پاتی ہے۔ کہتی ہے: تم تب تک اُس سے جدا ہو، جب تک وہ زندہ ہے۔ نہ اُس خدا نے تمھیں ہمیں دیتے ہوئے پوچھا تھا، نہ تمھیں لے جاتے وقت پوچھا؛ اور پوچھتا بھی کیوں! اُسی نے بھیجا تھا، وہی لے گیا۔

میرا کیا ہے۔ زندگی کو سدھارتے یا یوں کہو کہ آزمایشوں سے گزرتے، گزر رہی ہے۔ کہوں تو اُس کے کرم اور اس کی رحمتیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں اور مکر جاؤں تو سوائے رسوائی کے ہے نہیں کچھ میرے پاس۔ اب تمھارا آنا اُس کی رحمت کا اظہار تھا تو شاید تمھارا جانا تمھارے لیے اُس کی رحمت کا اظہار۔ یہاں رہتے، تمھیں کچھ اندرونی مسائل ضرور تھے۔ تم تکلیف میں تھے، مگر ہنستے تھے، کھیلتے تھے، بھاگتے تھے، دوڑتے تھے۔ اب وہاں اِن اندرونی تکلیفوں سے دور خوش و خرم رہنا۔

اُس کے فضل اور کرم کے آگے سر جھکتا ہے۔ کیا کیا کرم کر چھوڑے اُس نے۔ جب تم پہلی بار بیمار ہوئے، تب بھی لے جا سکتا تھا؛ اُس نے کرم کیا اور سات سال مزید دیے۔ ہم خوش ہوئے، ہم رو دیے، مقصود تھا کرم اُس کا۔ ہم ساتھ رہے، ہم نے زندگی کے مزے کیے۔ ہم دن رات ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ کیا کم کرم ہے یہ۔ درخواستیں کی تھیں، التجائیں بھیجی تھیں کہ مالک، کچھ اور وقت کہ انسان ہوں اور مانگتا ہوں۔ تمھارے سرہانے کھڑا تھا تو ہر لمحے کہتا تھا: اچھا، کچھ سال نہ سہی، کچھ مہینے نہ سہی، ہفتے دن نہ سہی، بس ایک لمحہ اور، اور دیکھو اُس کا کرم کہ اُس نے اِس بستر پر تمھیں پانچ دن دیے۔ اب اُس کا شکر ادا کروں کہ نہ کروں۔ لمحہ لمحہ مانگتا تھا، وہ دن دے دیتا تھا۔ یوں اُس نے جو پانچ دن دیے، سوچو ذرا کروڑوں اربوں لمحے اُس نے جھولی میں ڈال دیے۔ کیوں نہ سر سجدے میں رکھوں اور کہوں کہ تیرا کرم ہے مولا!

مشکل تھے وہ لمحے، مگر تھے تو۔ مالک ہے، نہ دیتا تو کیا کر لیتے۔ آخری پانچ دن ہم ساتھ میں تھے۔ میں کہیں نہیں گیا اور تمھیں میرا انتظار بھی نہیں کرنا پڑا۔ وہیں تمھارے در پر پڑا تھا اور اُس کی رحمتوں کے در کھلنے کا منتظر۔ یوں نہیں ہوا کہ وہ تمھیں لے گیا۔ ہوا یوں کہ میں کم زور پڑ گیا تھا، آزمایش میری تھی، بھگت تم رہے تھے۔ بس کم زوری میں دعا کر بیٹھا کہ بس اور نہیں، اِس کی تکلیف آسان کر دے، بس اُس نے کر دی۔ میں اُس کی آزمایش میں ناکام ٹھیرا، میرا صبر ختم ہوا۔ مجھ سے تمھاری تکلیف دیکھی نہ جاتی تھی اور اُس سے میرا دکھ۔ اُس نے میری التجا سن لی کہ تجھے تکلیف سے چھٹکارا دے، لیکن شاید یہ نہ سنا کہ اِسی دنیا میں! یا شاید میں اِس طرح سے کہہ نہیں

پایااُسے، میرے الفاظ مدعا بیان نہ کر سکے۔ شاید میری آنکھوں میں دعاؤں کا جنون اور جبیں پر نمازوں کے نشان نہ تھے۔ مجھے معلوم ہے، تم کہو گے کہ وہ تو دلوں کے حال جانتا ہے، پھر الفاظ کیوں۔ وہ یوں کہ دل تو کالا پڑا ہے۔ اُس کی یاد سے منور ہوتا، تو روشن دل میں وہ کچھ دیکھ پاتا نا!

آخری چند دنوں میں تمھیں جھٹکے آنے لگے تھے، ایسا لوگ کہتے ہیں۔ میں وہاں تھا، وہیں کھڑا تھا۔ تمھارے ہاتھوں میں ہاتھ تھے۔ مجھے تو تمھارا زور سے ہلتا سر حالت حضوری کا لگتا تھا: اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو۔ اور تم شاید اُسی خدا کو دیکھ کر مست تھے؛ مسرور تھے؛ شادمان تھے۔ بیٹے، تم حالت حضوری میں تھے، لیکن دنیا کو جھٹکے نظر آتے تھے۔ میرا بیٹا خدا کے حضور پیش ہونے کی خوشی میں تھا، کیوں نہ ہوتا کہ میرا بیٹا تھا۔ خدا، خدا اور بس خدا۔ تمھارے زور کے سر ہلانے سے پہلے میں ڈرا، پھر خوش ہوا کہ میرا مسرور و خوش بچہ، اللہ اکبر، اللہ اکبر اور 'لبیک، اللّٰھم لبیک'، کی صدا لگاتا خدا کی بارگاہ دیکھتا ہے اور خوش کہ بس اب داخل ہوا کہ تب۔

بیٹے، میں بہت کم زور ہوں، اپنے خدا سے لڑ نہیں سکتا تھا، سو نہیں لڑا، بس کہہ دیا کہ بالکل نہیں کوئی مصنوعی زندگی بالکل نہیں۔ ڈاکٹروں سے کہہ دیا تھا کہ صرف اپنی سی کوشش کریں، انسانی کوشش۔ کوئی مصنوعی طریقے سے سانس مجھے قبول نہ تھا۔ اِس لیے کہہ دیا تھا، میرے بچے کو بلانے کا حق اُسی کا ہے؛ جب بلا لے تو ایک لمحے کی تاخیر نہ کرنا کہ سوائے اُس کے ہے نہیں کچھ میرے پاس۔ میں مطمئن ہوں۔ اُس نے تمھاری خوشی مجھے تمھاری حالت حضوری سے دکھادی تھی۔

اب وہاں ہو تو بھائی، ذرا سی سفارش کرنا؛ کہنا، آپ کا ایک ادنیٰ سا بندہ چھوڑ آیا ہوں۔ دیکھتا تھا کہ وہ آپ کے لیے جیتا تھا۔ بس بہت گناہ گار ہے، مگر "چنگا ہے یا مندا ہے، بس آپ ہی کا بندہ ہے"۔ اُسے معاف فرما دیں اور اُس کے گناہوں سے نظریں پھیر لیں۔ کہنا، اُس نے مجھے بالکل نہیں روکا۔ وہ کہتا تھا کہ جاؤ میرا خدا تمھیں بلاتا ہے۔ شان سے جاؤ کہ جنت تمھاری منتظر ہے۔ اُس کو یقین تھا کہ میں جنت میں ہوں گا۔ کہنا، وہ کہتا تھا کہ جب اُس نے دیا تھا تو خوشیاں منائی تھیں، شکر بجالایا تھا؛ جب لے جا رہا ہے تو خندہ پیشانی سے واپس کروں گا کہ لوٹانے کا یہی اصول ہے۔ 'مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ، وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى'۔

ہاں یار، ایک آخری بات، معاف کرنا، لوگ کہتے رہے، مگر میں نے خدا سے براہ راست دعا کے سوا کوئی ایسا کام نہیں کیا، جو مجھے اُس سے دور کرنے کا باعث بنتا۔ میں نہیں مانا، بلکہ میں اُن سے کہتا تھا کہ مجھے ڈر ہے، شدید ڈر ہے کہ کہیں وہ تمھیں صرف اِس لیے ٹھیک نہ کر دے کہ میں نے اُس کا در چھوڑ کر کسی اور کی طرف نظر کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے۔ مجھے یقین تھا کہ یہی میری آزمایش ہے۔ مجھے یقین تھا کہ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے، کیونکہ یہی تو امتحان تھا کہ میں اُس در کی چوکھٹ سے ہٹوں اور وہ کہے کہ بس، جاؤ لے لو اِسے اور اب شکل مت دکھانا۔ میں نہیں گیا۔ میں تمھیں اُسی سے پانا اور اُسی کے لیے کھونا چاہتا تھا۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ بھائی، تم تو ہو گے جنت میں، تو ہماری ملاقات مشکل ہے کہ مجھ سا گناہ گار کہاں، جنت کہاں۔ بھائی، ہم تو خدا کی رحمت و کرم کی امید پر ہیں بس، نہ کوئی زاد سفر ہے، نہ نیک اعمال کی پوٹلی، ہاں البتہ مجھے یقین ہے کہ تمھاری ماں سے تمھاری ملاقات ان شاء اللہ لازماً ہو گی، تو بس اُس سے اپنے گناہ گار باپ کے حالات پوچھتے رہنا۔

صبح پانچ بج کر دس منٹ پر ڈاکٹر نے آئی سی یو میں بلایا تھا۔ تم وینٹیلیٹر پر تھے، سانس اکھڑ رہا تھا۔ میرا سانس شاید کہیں جسم میں ہی بھٹک گیا تھا۔ دل کی دھڑکن ڈوب ڈوب کر ابھرتی تھی۔

تم اپنی نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھتے تھے۔ شاید، میں نے تمھاری آنکھوں کو اپنے لرزتے ہاتھوں سے بند کر دیا تھا۔

تجھے آغوش میں لینے کو آئی رحمت باری
تجھے فردوس میں اماں سے حوریں ہو گئیں پیاری

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد حسنین اشرف

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا

قابل نہیں رہا تو بس ایک تسلی ہے، ہمارا دل کبھی کوئی عرض گزارنے لائق تھا ہی نہیں۔ ہم نے اظہار پر ہمیشہ اخفا کو مقدم کیا۔ تم اسے بزدلی کہو یا کم ہمتی۔ بہر حال ہم نے ہمیشہ اسی کو اپنے دل میں جاگزیں پایا۔

تمھارا حال تم سے اور تمھارے چاہنے والوں سے کیا کہیں؟ تم تو ہر دم، ہر لمحہ سراپا ادائیں تھے۔ عشق کی نیاز بانٹتی ادائیں، شرارتیں، اٹھکھیلیاں۔ یہ نیاز تم اپنے ارد گرد بس بانٹتے پھرے اور ہم تم سے دور اس ایک بچے کے مانند تمھیں تاکا کیے جو قیمتی شے کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ تو سکتا ہے، لیکن اس کا دل جانتا ہے کہ یہ ہیرا اس کی بساط سے باہر کی شے ہے۔

تمھیں خدا نے اس گود میں دیا جس کی ممتا کے لائق تھے تم؛ اس باپ کے حوالے کیا جس کی پدرانہ شفقت نے سائبان کے مانند تمھیں ڈھانپنے کی کوشش میں شب و روز کی دھوپ کو پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں بنا دیا؛ وہ بھائی کہ وقت کی مسافرت میں رفیق کار ہو جائے تو منزلیں آسان ہو جاتی ہیں اور اس بہن کو تمھاری ہم راہی دی جس کی نرماہٹ نے وقت کی سختیوں کو تم پر آسان کر دیا ہو گا۔

تم بولتے نہیں تھے، شاید کسی کی سنتے بھی نہیں تھے، لیکن یہ سب تمھارے دست و بازو ہی تو تھے۔ تمھارے ادھورے الفاظ کے شارحین، تمھاری اداؤں کے مفسر اور تمھارے اشاروں کے مترجم۔ کیا کھانا ہے، کب کھانا ہے، ٹھنڈا ہے، گرم ہو گا۔ مزاج کی سختی، اداؤں کی کجی۔ خدا نے ان سب کو تمھارے آنکھ، کان اور بازو ہی تو بنا دیا تھا۔

ارے! یہ قربانی نہیں، بلکہ عشق کی قیمت ہے، اداؤں کا صلہ ہے جو ہر عاشق صادق کو ادا کرنا ہی پڑتا ہے کہ

محبوب کی جناب سے عشق کی نیاز میں کچھ حصہ اسی کے جواب میں ملا کرتا ہے۔

تم پھول تھے ؟ نہیں ! تم چاند تھے ؟ ہرگز نہیں ! تم، بس تم تھے۔ کسی استعارے میں تخیل کی وہ وسعت اور صفت کا ایکا نہیں کہ وہ تمھارے بیان کی تکمیل کے لیے ادنیٰ درجے میں بھی کھپایا جاسکے۔ تم، نوشیروان تھے، شیرو تھے !

انسان کا جسم منوں مٹی تلے دفنایا جاسکتا ہے، لیکن جو کفنایا نہیں جاسکتا، وہ اس کی یادیں ہیں۔ تمھاری یادیں، گھر کی دہلیز پر پڑی ہیں۔ کمرے اور دالان تمھاری شرارتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ سو تم یہیں ہو۔ سب کے پاس۔

پانی کی وہ بوتل جو پچھلی ملاقات پر تم نے چباڈالی تھی اور سارے راستے اس سے پانی رستا رہا۔ میری میز پر پڑی ہے۔ میرے جنم دن پر تمھارا کیک کاٹنا۔ یہ سب ہمارے چہرے پر مسکراہٹیں بکھیرتا رہے گا۔

نیم درد بھری مسکراہٹیں !

یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ. ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔

خداحافظ شیرو !

خداحافظ بیٹا !

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جواد احمد غامدی

شیرو (نوشیروان) کا ایک سال اور بیت گیا

(بیٹے کے نام باپ کا خط جو اس کی ساتویں سال گرہ پر لکھا گیا تھا)

آج سے چھ سال قبل جب تم ایک سال کے تھے تو ہم تمھارے ایک سال کا ہو جانے کی خوشیاں مناتے تھے۔ پھر اچانک تم بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ باپ کے کاندھوں پر بیٹا پڑا تھا اور میں اور تمھاری ماں ہسپتال کو بھاگتے تھے۔ پہنچے تو معلوم ہوا کہ تمھیں گردن توڑ بخار ہوا ہے۔ تمھیں وینٹیلیٹر پر ڈال دیا گیا۔ ایک ایک دن صدیوں میں گزرتا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ تمھیں GSD بھی ہے۔ چھبیس دن وہیں پڑے رہے۔ جب ہم وینٹیلیٹر اتارنے کا سوچ رہے تھے، خدا نے تمھاری آنکھیں کھول دیں، اور یوں لگا جیسے سوکھے دھانوں پانی کی ایک بوند۔ پھر معلوم ہوا کہ تم آٹسٹک بھی ہو۔

تمھیں ایسے ہی سنبھالتے رہے اور کورن سٹارچ پلا پلا کر سانس کی امید بڑھاتے رہے۔ تمھاری ماں نے اس دن سے آج تک شاید کوئی رات ایسی نہ گزاری ہو کہ ساری رات اُس کی جاے نماز اشکوں سے بھیگ نہ رہی ہو۔ بس کام سے فارغ ہوئی اور سر سجدے میں رکھ دیا؛ خدا کے گھر سے صبح کی اذان ہوئی تو اٹھا۔ صبح اُس کا جاے نماز نچوڑا جائے تو ماں کی حسرت سے دریا بھر جائیں۔ تمھاری بیماری کا ذکر کسی سے ہو جائے اور اُس میں کوئی ذرا ادھر کا جملہ نکل جائے تو فوراً بپھر جاتی ہے، کیا ہوا میرے بچے کو ہنستا کھیلتا ہے ماشاءاللہ۔ اللہ کا کتنا کرم ہے ہم پر۔ بیمار ہوں اُس کے دشمن، اور پھر ساتھ ہی بول دیتی ہے، نہیں خدا اُس کے دشمنوں کو بھی تندرست ہی رکھے۔

اُس نے اور میں نے جس سے جو معلوم پڑا، کیا، لیکن جادو ٹونے والوں کی کسی سے سنی، نہ اُس طرف کبھی دھیان دیا، اور کیوں دیتے میرا خدا اُن سب سے بہت بڑا ہے۔ اُن سب سے جو یہ سب کرنے کی صلاحیت رکھتے

ہیں۔ تو اُس سب سے بڑے کو چھوڑ کر کسی اور کا در کھٹکھٹانا ہمیں منظور نہ تھا۔ سو تمھارے لیے جو بن پڑا کیا، اور کر رہے ہیں، سوائے اِس کے کہ کسی جادو ٹونے والے کے در پر جائیں۔

اب تم سات سال کے ہوئے ہو۔ ہر سال ایک چٹھی لکھ رکھتا ہوں کہ جب تم بولنے، سمجھنے لگو گے تو بھائی ہم سے تو سارے قصے سنائے نہ جائیں گے۔ اور یوں بھی جب تم ٹھیک ہی ہو جاؤ گے ان شاءاللہ تو پھر کس کم بخت کو ماضی کو یاد کرنا ہے۔

ہم دونوں باپ بیٹا بیٹھیں گے، باتیں کریں گے۔ ہم تو اب بھی دوست ہی ہیں۔ تم میں جانے اتنی جان کہاں سے آجاتی ہے۔ ایسا زور سے مارتے ہو کہ تارے نظر آنے لگتے ہیں، مگر ایسی جپھی ڈالتے ہو کہ تارے زمیں پر آنے لگتے ہیں۔ تو بھائی کل ملا کر بات یہ ہے کہ ہم دونوں کی دوستی بڑی عجیب سی ہے، تم مارتے بھی ہو اور پیار بھی کرتے ہو۔ مجھے بس ایسے ہی چاہیے۔ مارتے رہنا، مگر ٹھیک ہو کر۔ ہم دونوں پھر کشتی کر لیا کریں گے، لیکن یہ نہیں کہ اب تم خود ہی، جب دل چاہے یہ کرو، جب دل چاہے وہ کرو۔ بھئی، ہم بھی دل رکھتے ہیں، بھلے تم جیسا نہ سہی۔ معمولی سا ہی سہی۔ ہمیں کبھی خود بھی پیار کرنا ہے اور کبھی اپنی مرضی سے مار بھی کھانی ہے۔

سنا تھا کہ میرا خدا جب کچھ لیتا ہے تو کچھ ایسا دے دیتا ہے، جو کمال ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو اُس نے تمھیں کیا کمال عطا کیا ہے اور دیکھو وہ کیسا رحیم ہے، اُس نے جو ذرا سا نہیں دیا، ہم اُس پر پریشان ہوتے ہیں اور جو اُس نے تمھیں ایک منفرد کمال عطا کر دیا ہے، اُس کا ذکر ہی نہیں، انسان ناشکرا ہے نا۔ ابھی تمھیں پتا نہیں، اِس لیے لکھ رہا ہوں۔ جب تمھیں پتا چلنے لگے گا نا تب خود پڑھ لینا، ہم سے مت پوچھنا۔ جانے میں اور تمھاری ماں اُس وقت تک ہوں نہ ہوں، یا جانے ہم اتنے بوڑھے ہو چکے ہوں کہ سنا سکیں یا نہیں۔

اچھا سنو، وہ کمال یہ ہے کہ یار تمھاری آنکھیں بولتی ہیں اور تمھارا چہرہ دیکھ کر تم پر مر مٹنے کو دل چاہتا ہے؛ صرف ہمارا ہی نہیں، سب لوگ ایسا ہی کہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں، تم میں وہ اٹریکشن ہے، جو عام نہیں ملتی۔

اور پھر دیکھو تم ہنستے ہو اور بے تحاشا ہنستے ہو، ہے نہ نعمت خداوندی۔ تم چلتے ہو، پھرتے ہو، بھاگتے ہو، دوڑتے ہو، اپنا مدعا بتاتے ہو، گو اِس کا طریقہ عام لوگوں سے مختلف ہے، وہ بول کر بتاتے ہیں، تم ہاتھ پکڑ کر بتاتے ہو۔ اور اچھا ہی ہے یار ہم بولنے والے کون سا تول تول بول رہے ہیں، جو بکواس ہونٹوں پر آجاتی ہے، اگل پھینکتے ہیں۔ کل ملا کر یہ کہ سب کچھ تو ہے یار تمھارے پاس۔ اور دیکھو خدا کتنا مہربان ہے تم پر کہ اُس نے تمھیں ایک مکمل انسان پیدا کیا ہے۔ چھوٹے موٹے مسائل تو یار ہم سب کے بھی ہوتے ہیں۔

اچھا، میں سوچ رہا تھا کہ اب جب تم سات سال کے ہو گئے ہو تو کبھی کبھی ماں باپ سے محبت کا اظہار ایک آدھ حرف بول کر کر دیا کرو، دیکھو وہ بھی اگر تمھیں مناسب لگے۔

بھئی، بات یہ ہے کہ ہم سے براہ راست رابطے میں ہوتے اللہ میاں تو ہم ہاتھ پکڑ لیتے، گھٹنوں پر بیٹھ جاتے، سر اُن کے قدموں میں رکھ دیتے اور بس اتنا کہتے کہ اتنی سی زبان دے دے کہ تم اپنی تکلیف بتا سکو۔ اتنا تڑپنا اور بتا بھی نہ سکنا کہ ہوا کیا ہے۔ بس یہ تھوڑا سا مسئلہ ہے۔ وہ بھی اُسی کی کوئی مصلحت ہو گی۔ کوئی گلہ نہیں ہے، بس ایک درخواست ہے۔ رحیم و کریم ہے، کسی روز بس ایسے ہی بیٹھے بیٹھے اشارہ ہو جائے تو اور کیا چاہیے۔

اور ہاں تمھارا جو بھائی ہے نا، وہ تو کمال ہے بھئی۔ ہم سب کو اُس سے ڈانٹ پڑتی ہے، شیرو کا یہ کیوں نہیں ہوا، وہ کیوں نہیں ہوا۔ تمھیں بس یاد کرا دوں، جب تم خدا کی رضا سے کچھ بولتے تھے نا تو تم نے اپنے بڑے بھائی کو ''ایا'' کہنا شروع کیا تھا۔

تمھاری بہن بھی تم پر جان دیتی ہے۔ اُس سے تم ڈر بھی جاتے ہو۔ وہی تو تمھیں غلط کاموں سے روکتی ہے۔ خود سوچو! اب یہ کوئی اچھی بات ہے: چیزیں توڑ دینا، لکڑی چبا جانا، پلاسٹک چبانا اور نہ جانے کیا کیا۔ تو تھوڑی سی ڈانٹ تو بچو پھر ''آنا'' سے پڑے گی نا۔ یہ نام بھی تم لیا کرتے تھے بہن کا۔

اچھا سنو، تم سے تو کوئی فرشتہ بات وات کرنے آتا ہی ہو گا نا۔ کچھ پوچھتا ہو گا۔ کچھ سنتا ہو گا، سناتا ہو گا۔ تو سنو کبھی خدا سے گلہ نہ کرنا، بس درخواست کر دیا کرو کہ اللہ میاں جی میں ٹھیک ہوں، مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے، بس میرے امی ابا ذرا سے کم زور ہیں۔ تو نے ہی بنائے ہیں وہ بھی۔ اُن کو کچھ تکلیف پہنچتی ہے مجھ سے، تو آپ بس ذرا اتنا سا کرم، کچھ نظر عنایت فرما دیں، وہ بھی اگر آپ چاہیں، ورنہ سب بہترین چل رہا ہے۔ آپ کی عنایتوں کی بارش ہے بارش۔ تو جو کچھ تھوڑا بہت ہے، اُس کا کیا ہے۔ اب آدمی اتنا کچھ ہونے کے بعد ذرا ذرا سی چیزوں کے لیے پریشان ہوتا رہے، گلہ شکوہ کرتا رہے، کچھ دکان داروں کی سی بات لگتی ہے۔

بھئی، حوصلہ ہو تو تمھارے جیسا، نہ جانے کیا کچھ، خود میں، خود سے ہی برداشت کر لیتے ہو۔ نہ ہم سے شکایت، نہ بنانے والے سے شکوہ۔ خدا نے تمھیں پہاڑوں سا مضبوط دل دیا ہے۔ ورنہ ہم سا انسان تو اظہار کی کھلی چھوٹ لے کر ذرا سی تکلیف پر نہ جانے کیا کچھ شکوہ شکایت کرنا شروع کر دیتا۔ ایک تم ہو کہ اپنے اظہار پر شکر گزاری کی مسکراہٹ سجائے اور تکلیف پر صبر کا تبسم لیے پھرتے رہتے ہو۔ بھئی، ہم نے تو زمانے میں ایسی شکر گزاری شاذ ہی دیکھی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تم سے بس بات کیے جانے کا دل کرتا ہے، جب تک کہ تم میری کسک دیکھ کر بول نہ اٹھو۔ دنیا کے لیے تمھارا اظہار چاہے ادھورا ہو، لیکن میں تو باپ ہوں نا۔ یعقوب سا باپ۔ یوسف کے کرتے کی خوش بو پا کر کہنے لگے: اگر تم یہ نہ کہو کہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے تو مجھے یوسف کی خوش بو آتی ہے۔ یوں ہی میں بھی تمھارے مکمل تکلم سے واقف ہوں۔ بس کبھی خواہش ہوتی ہے کہ دل کے بجائے اپنے کان سے تمھاری شیریں آواز سنوں۔

خیر، آج تمھارا جنم دن ہے۔ تمھارا دن ہے، بلکہ ہمارے گھر میں تو ہر دن تمھارا ہوتا ہے۔ تمھاری ماں کا، بہن کا، بڑے بھائی کا اور میرا۔ ہم سب کا دن تو تمھارے گرد، تمھارے لیے ہوتا ہے۔ خدا سے بس دعا ہے کہ اُس کی جناب میں تو کچھ کمی نہیں۔ وہ تمھیں بہت جلد اچھا کر دے۔ وہ بے شک، میری اور تمھاری ماں کے دل سے نکلتی ہر دعا کو جانتا ہے۔ باقی ہمارا کیا ہے، تمھارے ایک حرف کو سننے کی امید میں جیے جاتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وقاص رشید

فرشتے نوشیروان کا پیغام اپنے والدین کے نام...

فرشتے آسمانوں سے
اترتے ہیں زمیں پہ سب
اُنھیں جب حکم دیتا ہے
زمین و آسماں کا رب
زمیں سے پَر فرشتہ اک
فلک پہ آج پہنچا ہے
میری چشم تصور پر
یہ منظر آج ابھرا ہے
فرشتے نے وہاں جا کر
وہی گویائی پائی ہے
کہ اپنے رب کو واں جا کر
وہی بولی سنائی ہے
کہ جس کو سننے کی خاطر
سراپا کان تھے ماں باپ
خدا کے نام لیوا دو
بھلے انسان تھے ماں باپ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

فرشتہ چپ نہ رہتا ہے
وہ اپنے رب سے کہتا ہے
خدایا چند سالوں کی
وہاں جو زندگانی تھی
میرے ماں باپ نے مولا
میرے اُن آٹھ سالوں کا
ہر اک لمحہ گزارا ہے
کہ خود کو مجھ پہ وارا ہے
کہ میں بس ٹھیک ہو جاؤں
خدایا بول میں پاؤں
ہمارے سب کے اے خالق!
حیات و موت کے مالک!
تو اُن کو ہر عطا دے اب
اُنھیں مالک بتا دے اب
ترے نزدیک ہوں یا رب
میں بالکل ٹھیک ہوں یا رب
بہت روئے ہیں وہ دونوں
اُنھوں نے اب نہیں رونا
بہت دکھی رہے دونوں
پریشاں اب نہیں ہونا
کہ رب کی پیاری جنت میں
ابد تک اُس کی رحمت میں
گلوں جیسے کھلیں گے ہم
کہ اک دن پھر ملیں گے ہم

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

Trusted Name for Last 65 years

Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky
Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets

Since 1949

Snowhite
DRYCLEANERS
Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!

TQCSI
Quality Certified
ISO 9001 : 2000

Brands of the year Award
IT'S ALL ABOUT CHAMPIONS
2011-2012

Web: www.snowhite.com.pk

Tel: 021-38682810